ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموّں، جموّں

کلاس: ایم۔اے

مضمون : اُردو

کورس نمبر: 204 (غالب کا خصوصی مطالعہ)

سمسٹر: دوئم

یونٹ: I-IV

اکائی: 1-27

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کورڈی نیٹر، ایم۔اے، اردو

ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

۱۔ پروفیسر تنویر احمد علوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

۲۔ پروفیسر وجے دیو سنگھ، شعبہ اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

۳ ڈاکٹر لیاقت علی، لیکچرر، شعبہ اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی جموں۔

۴۔ مسعود احمد، نیٹ، جے۔آر۔ایف، ریسرچ اسکالر، جے۔این۔یو، نئی دہلی۔

اڈیٹنگ : ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ

(لیکچرر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

PG-URDU
SECOND SEMESTER
COURSE CODE URD-204

Examination to be held in May 2020, 2021 and 2022

TITLEOF THE COURSE: SPECIAL STUDY OF GHALIB

CREDITS: 4 MAXIMUM MARKS : 100

a) SEMESTER EXAM: 80 MARKS

b) INTERNAL ASSESSMENT: 20 MARKS

Objectives:

Ghalib is one of the stalwarts of Urdu literature, therefore, effort shall be made to make the students fully conversant with the various phases of his life and works. His multicoloured personality has to be promised in such a way that each of its shades gets specially projected.

UNIT-I. Textual study.

۱۔ دیوان غالب ۔ ردیف (الف) اور ردیف (ی)

۲۔ قصیدہ۔ ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام

UNIT-II Textual study.

۱۔ خطوط غالب (میر مہدی مجروح کے نام)

UNIT-III. Critical study of Ghalib's poetry and prose with special reference to the following aspects.

۱۔غالب کی غزل کے فکری پہلو ۲۔غالب بہ حیثیت غزل گو۔

۳۔غالب بہ حیثیت قصیدہ گوشاعر۔ ۴۔غالب کا تصور حسن وعشق

UNIT-IV. Critical study of the life and works of Ghalib with special references to the following.

۱۔غالب۔حالات زندگی،شخصیت اور عہد ۲۔کلام غالب،فکری،سیاسی،سماجی اثرات کی روشنی میں۔

۳۔غالب کا فن ۴۔اُردو نثر کے ارتقا میں غالب کا مقام

۵۔غالب کی طنز وظرافت۔ ۶۔غالب اور اس کے معاصرین۔ ۷۔غالب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات

NOTE FOR PAPER SETTER:

There are four units in the course No: URD-204

this Paper shall be devided in four Units viz Unit-I, Unit-II, Unit-III and Unit-IV. The paper setter shall be set two question from each Unit, the candidates shall be required to attempt one question from each Unit. The total number of questions to be attemted in this Paper shall be 4, which will carry equal marks. Unit wise distribution of marks shall be as Unit-I = 20, Unit-II = 20, Unit-III = 20, Unit-IV = 20. Total is 80. Distribution of Internal Assessments shall be two home assignments = 10x2 =20.

Books Prescribed :

۱۔دیوان غالب۔مرتب مالک رام ۲۔غالب کے خطوط مہدی مجروح کے نام۔مرتبہ خلیق انجم

Books Recommended:

۱۔یادگار غالب از حالؔی ۲۔ذکر غالبؔ از مالک رام ۳۔غالب نامہ از محمد اکرم

۴۔غالب تقلید اور اجتہاد از ڈاکٹر خورشید الاسلام ۵۔اطراف غالب از ڈاکٹر سید عبداللہ

فہرست

اکائی نمبر1-10	ردیف الف اور ردیف ی	01 -109
اکائی نمبر11	غالبؔ کی غزل گوئی	110-116
اکائی نمبر12	غالبؔ کی غزل کے فکری پہلو	117-124
اکائی نمبر13	غالبؔ کی اردو شاعری	125-131
اکائی نمبر14	غالبؔ کی غزل میں تصوف کے نشانات	132-139
اکائی نمبر15	غالبؔ بحیثیت قصیدہ گو شاعر	140-149
اکائی نمبر16	غالبؔ کا تصور حسن و عشق	150-158
اکائی نمبر17	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کا سوانحی خاکہ	159-164
اکائی نمبر18	اردو نثر کے ارتقاء میں غالبؔ کا مقام	291-298
اکائی نمبر19	دور غالبؔ کا تاریخی و معاشرتی ماحول	165-169
اکائی نمبر20-21	غالبؔ کا فن اور ان کی نثری تصانیف	170-177
اکائی نمبر22	غالبؔ کی طنز و ظرافت	178-186
اکائی نمبر23	خطوط غالب (میر مہدی مجروح کے نام)	195-253
اکائی نمبر24	غالب اور ان کے معاصرین	187-194
اکائی نمبر25	غالب کا قصیدہ ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام''	254-264
اکائی نمبر26	کلام غالبؔ فکری، سیاسی اور سماجی اثرات کی روشنی میں	265-278
اکائی نمبر27	غالبؔ کی مکتوب نگاری کی خصوصیات	279-290
	اسائنمنٹ سوالات	299-299

Course Contributors /Content Editing:

1. **Prof. Tanveer Ahmed Alvi (Jamia Millia Islamia, New Delhi)**
2. **Prof. Vijay Dev Singh (Department of Urdu, DDE.JU. Jammu)**
3. **Dr. Liaqat Ali (Incharge Teacher Urdu, DDE.JU. Jammu)**
4. **Masood Ahmed (Research Scholar/NET/JRF, JNU, New Delhi)**

Proofreading: & Editing. **Dr. Ajaz Hussain Shah**
Lect. Department of Urdu, University of Jammu, Jammu

© Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu 2018

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : M/S Chenab Printer/20/800

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL
M.A. URDU (SEMESTER-II)

COURSE NO: 204 (SPECIAL STUDY OF GHALIB)

UNIT I-IV **LESSON : 1-27**

PROF. (DR.) SHOHAB ANAYAT MALIK
COURSE CO-ORDINATOR P.G. URDU

DR. LIAQAT ALI
INCHARGE TEACHER

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu-180006

فہرست:

اکائی ۱-۱۰ ردیف الف	2-103
ردیف ی	104-109
اکائی ۱۱ غالب کی شاعری (جدت پسندی)	110-116
اکائی ۱۲ غالب کی غزل کے فکری پہلو	117-124
اکائی ۱۳ غالب کی اردو شاعری (مشکل پسندی)	125-131
اکائی ۱۴ غالب کی غزل میں تصوف کے نشانات	132-139
اکائی ۱۵ غالب بہ حیثیت قصیدہ گو شاعر	140-149
اکائی ۱۶ غالب کا تصور حسن و عشق	150-158
اکائی ۱۸ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ ایک مختصر سوانحی خاکہ	159-164
اکائی ۱۹ دور غالب کا تاریخی و معاشرتی ماحول	165-169
اکائی ۲۰-۲۱ غالب کا فن اور ان کی نثری تصانیف	170-177
اکائی ۲۲ غالب کی طنز و ظرافت	178-186
اکائی ۲۳ غالب کے جمالیاتی افکار	187-194
اکائی ۲۴ غالب اور ان کے معاصرین	195-202
اکائی ۲۵ غالب کی مکتوب نگاری	203-208
۱۔ خطوط غالب (میر مہدی مجروح کے نام)	209-267
۲۔ غالب کے قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام"	268-278

تشریحات:

ردیف۔الف

غزل نمبر:۱

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شعر نمبر(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مشکل الفاظ:

نقش: نقش سے مراد عالم مادی جس کے ساتھ ہزار شکلیں اور صورتیں موجود ہیں۔

فریادی: فریاد کرنے والا مگر ایسی فریاد جس کے ساتھ تقدیس کا شکوہ موجود ہو

شوخی تحریر: تحریر کی شوخی جس کے ساتھ حسن کا تصور اور ستم ظریفی کا کوئی پہلو موجود ہو۔

کاغذی پیرہن: ایسا لباس جو کاغذ کی طرح نازک مگر خوب صورت ہو پرکشش ہو۔

پیکر تصویر:　　تصویری مرقع۔ تصویر خوب صورت شے کو بھی کہتے ہیں۔

تشریح:

یہ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی مادی دُنیا اور یہ جان و جہاں کا مرقع جو بے حد دلکش اور دل آویز ہے، آخر یہ کس نے سجایا ہے اور اپنی شوخیٔ تحریر کا یہ حسین نمونہ پیش کیا ہے جس پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ خیال کر کے مزید حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ تو عارضی ہے، وقتی ہے اور آن کی آن میں بدل جانے والا۔ یہاں جس شے پر نظر ڈالی جاتی ہے وہ بے اختیار ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر اسی کے ساتھ کہ یہ خوب صورت بھی ہے اور زوال پذیر بھی کہ اسے کاغذی پیرہن کہہ سکتے ہیں۔

غالبؔ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ایران میں دستور تھا کہ فریاد کرنے والا کاغذی لباس پہن کر جاتا تھا۔ یہیں سے اس شعر میں کاغذی اور پیرہن کا تصور آیا ہے مگر یہ کوئی سنی سنائی بات ہے۔ اس زمانے میں اتنا کاغذ ہوتا ہی نہیں تھا کہ فریاد کرنے والے کاغذی لباس پہن کر جائیں۔ بہر حال اس سے دُنیا کی ناپائیداری بھی ظاہر ہوتی ہے اور خوب صورتی بھی۔

شعر نمبر (۲) کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

مشکل الفاظ:

کاو کاو:　اضطراب، بے چینی، بے قراری، بے سکونی

سخت جانی: سخت جان ہونا۔ اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی بے حد مشکلات اور تکلیفوں کے عالم میں جیتا رہتا ہے اور سخت امتحانوں سے گزرتا ہے۔

جوئے شیر لانا: ایران کا محاورہ ہے اور اس کے پس منظر میں یہ روایت موجود ہے کہ فرہاد اپنی محبوبہ شیریں کی فرمائش پر کوہِ بے ستون کو توڑ کر دودھ کی نہر لایا تھا جو شیریں کے محل میں بہتی تھی۔

تشریح:

تنہائی کے عالم میں ایک ایک گھڑی کا بتانا بھی سخت مشکل ہوتا ہے۔ انتظار کے لیے کیا جاتا ہے کہ وہ

موت سے زیادہ سخت ہے۔ ایسے عالم میں وہ اضطراب، بے چینی اور بے قراری میں گھرا ہوا ہو، ایک لمحے کے لیے بھی اسے سکون نہ ہو، انسان کے جیتے رہنا بہت کٹھن ہوتا ہے اور شام سے صبح تک کا وقت گزارنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ جوئے شیر دودھ کی نہر کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد ہے جدائی کے لمحوں میں اور خاص طور پر شب فراق کی ساعتوں میں انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ وقت گزارنا موت کے لمحوں سے بھی زیادہ کٹھن وقت ہوتا ہے کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی بڑا ایک امتحان ہے۔

شعر نمبر (۳) جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

مشکل الفاظ:

جذبۂ بے اختیار شوق:	جذبۂ بے اختیار وہ جذبہ جو آدمی کو بے اختیار کر دے، اس کی اپنی طبیعت پر اس کا قابو نہ رہے اور یہ انتہائے شوق کے عالم میں ہوتا ہے۔
دیکھا چاہیے:	دیکھنے کے لائق۔ اور کون جانے کہ اس کا انجام کیا ہو۔
سینۂ شمشیر:	تلوار کا سینہ
دم شمشیر:	تلوار کا سانس، اس کا دم، ورد و قتل کرنے کی قوت

تشریح:

میں اپنے ذوق و شوق میں اپنی خواہش اور اپنی خوشی میں دیوانہ ہوا جا رہا ہوں اور دیوانہ وار قاتل کی طرف بڑھ رہا ہوں اور میرا خون جوش مار رہا ہے کہ اس کی وجہ سے تلوار کا دم اس کے سینے سے باہر آیا جا رہا ہے۔ وہ بجلی کی طرح چمک رہی ہے اور بجلی کی لہری طرح میری طرف بے اختیار آنا چاہتی ہے۔ ذوق و شوق کی شدت گویا میرے قاتل کی طرف بے اختیار بڑھنے ہی سے سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی کہ یہ منظر کہاں دیکھنے کو ملتا ہے کہ دم شمشیر، سینۂ شمشیر سے باہر ہوا جاتا ہے۔ اقبال کا ایک شعر ہے۔

ٹھہر ٹھہر کہ بہت دل کشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیِ شمشیر

یہی شمشیر کی تابناکی ہے جسے تلوار کی آبداری کہتے ہیں اور اس سے مراد قاتل کی نیت بھی ہے جو اپنے ہاتھ میں اپنی ہوئی تلوار سے مجھے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔

غالب کے یہاں جذبے کی جو شدت ملتی ہے، گیرائی اور گہرائی ملتی ہے، اس شعر کی لفظیات اور شاعرانہ لب ولہجہ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کی خواہش اور خوشی، انتہائے شوق کا اظہار ہے۔ غالب کا ایک اور شعر ہے:

خود وہاں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

شعر نمبر (۳) آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مشکل الفاظ:

آگہی: آگاہ ہونا۔ واقف ہونا۔ عقل و دانش سے کام لینا

دامِ شنیدن: سننے کا جال، سننے اور سمجھنے کی خواہش، کوشش

مدعا: مقصد

عنقا: ایک فرضی پرندہ جس کو ہم خیالی طور پر جانتے ہیں، مانتے ہیں لیکن وہ کہیں نہیں پایا جاتا، کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسی لیے جو شے کہیں ہوتی نہیں ملتی۔ اسے کہا جاتا ہے کہ وہ تو عنقا ہو رہی ہے۔ (اسی طرح کا ایک فرضی پرندہ ہما بھی ہے)

عالمِ تقریر: گفتگو کا جہان، کہنے اور سننے کا ماحول۔

تشریح:

غالب پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ ان کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس شعر میں انھوں نے اسی کا جواب دیا ہے اور مخالفوں کے رویے پر اظہار خیال کیا ہے۔ کہ میرا کلام اپنے معانی کے اعتبار سے صرف سن کر سمجھ میں آنے کی بات نہیں ہے، عنقا کبھی جال میں قید نہیں ہوتا، جسے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ جال میں گرفتار کیسے کر سکتا ہے۔

یہی معاملہ میری شاعری اور میرے فن کارانہ شعوری رسائیوں کا بھی ہے کہ ان تک کسی کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ وہ ہزار سننے کا جال بچھائے، توجہ سے سنے مگر میرے کلام کے معنی اور معنویت تک نہیں پہنچ سکتا۔ غالب نے ایک اور شعر میں بھی اس ذہنی کشمکش کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شعر نمبر (۵) بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مشکل الفاظ:

بس کہ ہوں: از بس کہ ہوں۔ بس کہ کے معنی یہاں شدت کے ہیں۔

آتش زیر پا: جس کا پیر انگارے پر رکھا جاتا ہے وہ بے ساختہ اور بے اختیاری کے عالم میں اپنی بے قراری کا اظہار کرتا ہے۔ فارسی زبان میں آتش زیر پا ہونا محاورہ ہے

موئے آتش دیدہ: آگ سے جلا ہوا بال

حلقۂ زنجیر: زنجیر کے حلقے کی کڑیاں۔ مراد گرفتاری کا ذریعہ، قید کا وسیلہ۔

تشریح:

اے غالب اگرچہ میں قید ہوں، گرفتاری کے عالم میں ہوں مگر میرے پاؤں میں گرمی رفتار انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور شعلوں کا سا حکم رکھتی ہے۔ اس لیے جو بیڑیاں مجھے پہنائی گئی ہیں وہ اس گرمی رفتار

سے جل گئی ہیں اور موئے آتش دیدہ کی طرح جلے ہوئے بالوں کے حلقوں کی طرح نظر آتی ہے۔

موئے آتش دیدہ غالب کی نئی ترکیب ہے اور غالب کے یہاں اظہار خیال کا جو طریقہ ہے اس کی طرف یہ لفظی ترکیب جو اشارہ و علامت بن گئی ہے۔ پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن کو غالب کی فکری جدتوں کی طرف مائل کرتی ہے۔

یہ غالب کے اس دور شاعری کی غزل معلوم ہوتی ہے جب وہ بیدل کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور مضامین خیالی لکھتے تھے۔

غزل نمبر۴

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

شعر نمبر(۱) جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

مشکل الفاظ:

جز:	سوائے
قیس:	مجنوں جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا نام قیس عامری تھا یعنی قبیلہ بنو عامر سے تعلق رکھنے والا اور لیلیٰ اس کی معشوقہ تھی جس کے عشق میں دیوانہ ہو کر وہ دشت پھرتا تھا۔ اس سے اسی کردار کا عکس اس وقت غالبؔ کے پیش نظر ہے۔
بروئے کار:	سامنے آنا۔ کسی کام کی انجام دہی پر تیار نظر آنا۔
صحرا:	جنگل، ریت کا دور تک پھیلا ہوا میدان
تنگیِ چشمِ حسود:	حسد کرنے والوں کی نگاہوں کی طرح تنگ اور کوتاہ نظری کا نمونہ

تشریح:

ہم دیکھتے ہیں کہ قیس کے سوا وہ صحرا نوردی کرتا نظر آتا تھا اور کوئی ایسا دیوانہ نہ تھا جو جنگل جنگل دیوانگی کے عالم میں پھرتا ہوا نظر آئے۔ اس کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ صحرا میں اتنی وسعت بھی نہ تھی کہ کوئی اور بھی اس میں سما جاتا۔ حیرت ہے کہ دور دور تک پھیلا ہوا صحرا بھی حسد کرنے والوں کی نگاہوں کی طرح تنگ تھا۔ جس طرح حسد کرنے والے کی نگاہ میں اس کی اپنی ذات کے علاوہ کسی کی سمائی یا گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی صورت صحرا کی بھی تھی۔ یہاں غالبؔ نے کسی دوسرے مجنوں کے سامنے نہ آنے کی عجیب و غریب شاعرانہ وجہ بیان کی ہے۔ وہ وہ کہ صحرا میں اتنی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے کہ وہ کسی اور کو بھی اپنے دامن میں جگہ دے۔ اسی لیے ہم ایک مجنوں کو دیکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور کو سامنے آتا ہوا نہیں دیکھتے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اتنی وسعت کہاں ہوتی ہے جو کوئی بڑا آدمی اس میں سما جائے۔ بڑے آدمی سے مراد بڑا کردار ہے اور مجنوں اپنے ذوق و شوق کے اعتبار سے ایسا ہی ایک بڑا کردار تھا جس کی کوئی دوسری مثال پھر سامنے نہ آ سکی۔

شعر نمبر (۲) آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست

ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

مشکل الفاظ:

آشفتگی: پریشانی، بکھراؤ، منتشر ہونا، انتشار کا عالم

نقشِ سویدا: سویدا دل کے اوپر نقطے جیسا ایک نشان جس کو غالبؔ نے نقشِ سویدا کہا ہے۔ یہ سیاہ ہوتا ہے اسی لیے اسے سویدا کہا جاتا ہے۔

دود: دھواں، یہ آگ سے اُٹھتا ہے اور ہوا کے شامل ہونے کی وجہ سے اس میں گردھیا بکھراؤ ہوتا ہے۔

سرمایہ: دولت، پونجی

تشریح:

میری آشفتگی نے دل سے اُٹھنے والے دھوئیں کی طرح میرے نقشِ سویدا کو آراستہ کر دیا جس طرح دھواں جب کہیں برابر جمتا رہتا ہے تو سیاہ نشان پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ دل کا داغ، دل سے اُٹھنے والے دھوئیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مسلسل دل جلتا رہا، اس سے دھواں اُٹھتا رہا۔ اسی کے نتیجے میں تو دل پر داغ جیسا ایک نقش، جسے نقشِ سویدا کہنا چاہیے، پیدا ہو گیا۔ یعنی میرے دل کا داغ میرے دل کے جلنے کا نتیجہ ہے۔

شعر نمبر (۳) تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مشکل الفاظ:

زیاں: نقصان

سود: فائدہ، نفع

تشریح:

یہ دنیا خواب و خیال ہے۔ یہاں کے تمام معاملات بھی خواب و خیال ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم کسی سے بھی معاملہ کریں، وہ معاملہ ایک تماشائے خواب سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آنکھ کھل جاتی ہے تو

نہ پھر نفع رہتا ہے نہ نقصان۔ یہاں جو کچھ ہے وہ ایک افسانے اور قصوں سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خواجہ میر دردؔ کا ایک شعر ہے اور اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

شعر نمبر(۴) پڑھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز

لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مشکل الفاظ:

مکتب: بچوں کا مدرسہ جہاں وہ قرآن کا سبق لیتے تھے یا ابتدائی درجے کی فارسی سیکھتے تھے۔ غالبؔ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہنوز: ابھی تک　　　رفت: گیا

بود: تھا

تشریح:

اے غالبؔ میں اپنے غمِ دل کے مدرسے میں پڑھتا ہوں مگر ایک مدت گزرنے پر بھی بات آگے نہیں بڑھی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں بس رفت و بود کے معنی جانتا ہوں جو فارسی زبان سیکھنے کے بہت ہی ابتدائی درجات ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نہ میں کچھ جانتا ہوں، نہ مجھے کچھ آتا ہے۔ اپنی اس کوشش کے باوجود مجھے کچھ نہیں آیا اور جو کچھ آیا وہ بہت ناکافی تھا اور آج بھی ناکافی ہے۔

جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

فارسی میں ایک محاورہ ہے 'معلوم نہ شد کہ ہیچ معلوم نہ شد' یعنی مجھے پتہ چل گیا کہ کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ یعنی علم کی ابتدا بھی علم کی انتہا ہوتی ہے اور انتہا پر پہنچ کر جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ بھی ابتدا ہوتی ہے۔

شعر نمبر(۵) تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مشکل الفاظ:

تیشہ:	وہ آلہ جس سے پتھر تراشا جاتا ہے یا توڑا جاتا ہے۔
کوہکن:	فرہاد، پہاڑ کھودنے والا۔ یعنی فرہاد۔
اسدؔ:	ابتدائی دور شاعری میں غالبؔ اسدؔ تخلص کرتے تھے۔
سرگشتہ:	سر پھرا اور دیوانہ
خمار:	نشہ
رسوم و قیود:	رسم کی جمع رسوم اور قید کی جمع قیود

تشریح:

اے اسدؔ کوہکن اپنے سر پر تیشہ مار کر مرا۔ یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کو تو اپنے محبوب کی بے وفائی کا خیال کر کے یونہی مر جانا چاہیے تھا اور اسی احساس کے اثر سے مر جانا چاہیے تھا۔ تیشہ مار کر مرنے کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے رسوم و قیود یعنی روایتی باتوں کو، پابندیوں کو ترک نہیں کیا تھا۔ یہی روایت کی پابندی ہے جس کو ہر آدمی نباہنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جب کہ ایک عشق کرنے والے کو تو اس روایت سے آزاد اور ان کی قیدوں سے بلند ہونا چاہیے۔

اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ غالبؔ روایت کی پابندی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے خلاف وہ ذہن کی آزادی کو بڑی بات سمجھتے تھے اور اسی پر زور دیتے تھے۔

غزل نمبر:۳

دل میرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
میں ہوں افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شعر نمبر(۱) دل میرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مشکل الفاظ:

جل گیا: جل کر خاک ہو گیا۔
سوزِ نہاں: چھپا ہوا سوز، دل کی جلن، عشق کی آگ
بے محابا: بے تعلق، بے تحاشا
آتشِ خاموش: خاموش آگ
گویا: یعنی

تشریح:

اردو شاعری میں عشق ایک طرح سے وہ خیال، وہ جذبہ اور شوق ہے جو دل میں آتشِ خاموش کی

طرح برابر باقی رہتا ہے اور اپنا اثر کرتا رہتا ہے۔ غالبؔ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محبت کی آگ نے، جسے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا، میرے دل کو جلا ڈالا اور جلا کر خاک کر دیا۔ آرزو کا ایک شعر ہے جو اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں
ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے

شعر نمبر (۲) دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مشکل الفاظ:

ذوقِ وصل: محبوب سے ملاقات کا شوق

یادِ یار: دوستوں سے یا اپنے خاص محبوب سے ملاقات کی یاد

تشریح:

آگ تو گھروں میں اب بھی لگتی ہے مگر پہلے زمانے میں زیادہ لگتی تھی۔ گھر کے در و دیوار میں اور خاص طور پر چھتوں میں گھاس پھوس یا لکڑی کی چیزیں زیادہ ہوتی تھیں جو جلدی آگ پکڑ لیتی تھیں اور پھر اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ گھر میں جو ساز و سامان ہوتا تھا وہ سب جل کر راکھ ہو جاتا تھا اور آگ بجھایا جانا پانی کی کمی کی وجہ سے ایک مشکل امر ہوتا تھا اور جو بھی اثاثہ گھر میں ہوتا تھا وہ جل جاتا تھا۔ غالبؔ کے سامنے ایسا ہی کوئی منظر ہوگا جس کو اس نے اپنے دل سے تشبیہ دی اور یہ کہا کہ میرے دل میں عشق کی آگ نے وہ طوفان برپا کیا کہ جو کچھ تھا وہ جل کر رہ گیا اور گھر کا گھر خاک ہو گیا۔

شعر نمبر (۳) میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

مشکل الفاظ:

عدم:	موت کی نیند یا وجود کی نفی Nothingness
غافل:	غفلت برتنے والا نادان
بارہا:	بہت بار
آتشیں:	وہ آواز جس میں آگ بھری ہو
بال:	بازو
عنقا:	فرضی پرندہ

تشریح:

اے میرے دیکھنے والو تم یہ نہیں جانتے کہ اب میرا وجود ہی باقی نہیں اور آتش شوق نے مجھے جلا کر رکھ دیا ورنہ جب تک میرا ذوق وشوق باقی تھا تو میری آہوں میں اتنی آگ اور ایسے شعلے ہوتے تھے کہ عنقا کے بازو بھی ان شعلوں سے جھلس جاتے تھے۔ اب میں خود عنقا سے اونچی منزل پر پہنچ گیا اور بے نام ونشان تو نہیں ہوا مگر میرا عدم و وجود برابر ہو گیا۔ اب تو میں ہی عنقا ہوں۔ نہ ہونے کے برابر ہوں بلکہ نہ ہونے کی صفت میں عنقا سے بھی آگے بڑھ گیا ہوں۔ جس کو غالبؔ نے عدم سے پرے ہونا کہا ہے۔

شعر نمبر (۳) عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مشکل الفاظ:

وحشت:	دیوانگی، جنون عشق، معشوق کی وارفتگی
جوہر:	فلسفے کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں اصل حقیقت، بنیادی خوبی، جس کے ساتھ کوئی مادی حقیقت وابستہ نہیں ہوتی۔

عرض: یہ بھی اصطلاح ہے یعنی جوہر کے مقابلے میں مادّی یا مرئی حقیقت نظر آنے والی جس کے ذریعے کسی جوہر کا اظہار ہو۔ ہم جوہر شمشیر کہتے ہیں، جوہر تحصیل کہتے ہیں۔ غالبؔ نے جوہر اندیشہ کہا ہے۔

صحرا: دشت، میدان

تشریح:

اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جوہر اندیشہ وہ عقلی وجود ہے جس کو مادّی سچائیوں کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا۔ صحرا ایک بڑی مرئی نظر آنے والی مادّی حقیقت ہے مگر اس لائق نہیں کہ اس کے جوہر اندیشہ اور اس کی گرمی، تیز رفتاری، وسعت اور پنہائیوں کو پیش کیا جا سکے۔ جوہر اندیشہ وہ چیز ہے کہ اس کا خیال آتے ہی آتش عشق بھڑک اٹھتی ہے اور صحرا جل جاتا ہے۔

غالبؔ کے یہاں بلندیوں، وسعتوں اور گہرائیوں کا تصور کسی نہ کسی مثال Image کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس شعر میں وہی ہوا ہے۔

شعر نمبر (۵) میں ہوں افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاک اہلِ دنیا جل گیا

مشکل الفاظ:

افسردگی: افسردہ دلی، طبیعت کا بجھ جانا، احساس محرومی

طرزِ تپاک: محبت کا اظہار اور خلوص کی نمائش

تشریح:

اے غالبؔ، میں تو بے طرح افسردہ خاطر ہوں، میری دلی خواہشیں مر گئی ہیں اور میرا احساس محرومی اب مجھے کچھ سوچنے کرنے نہیں دیتا اور کوئی میرا ہمدرد و مخلص بھی نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں کا طرزِ تپاک

دیکھ کر تو میرا دل جل گیا ہے کہ یہ کچھ نہیں کرتے، کچھ کرنا بھی نہیں چاہتے اور ہمدردی کا اظہار کرنے، خوامخواہ کی محبت جتانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ بھی خلوص کی نمائش ہے۔ اور بس اس پر کوئی کیا مطمئن ہو سکتا ہے۔

غزل نمبر:۳

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

شعر نمبر(۱) شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مشکل الفاظ:

شوق: عشق، جذبۂ بے اختیار، شدید خواہش

ہر رنگ: ہر طور پر، ہر صورت میں

رقیب: دشمن، مخالف

سر و ساماں: دولت و ثروت

قیس: مجنوں، لیلیٰ کا عاشق زار

تصویر کا پردا: تصویر ہر طرح بنے بنائے اور سجے سجائے کی صورت کو کہتے ہیں۔ اسی لیے تصویر بنا ہوا ہونا خوب صورت پر کشش اور واضح ہونا بھی ہے۔

عریاں: برہنہ، ننگا

تشریح:

جب آدمی کسی بات کا بے حد شوق رکھتا ہے تو پھر دوسری باتوں کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے۔ جہاں تک دنیاوی مال و دولت کا سوال ہے اکثر ایسے لوگ دنیا حاصل کرنے کا شوق چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے غالب نے اپنے خلوص خاطر، اپنے جذبۂ بے اختیار اور شوق سر و ساماں کا رقیب کہا ہے اور اس کی وضاحت دوسرے مصرعے میں کی ہے کہ مجنوں لیلیٰ سے عشق کو سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے ماسوا کسی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے لیے تو برہنگی اور عریانی وجہ آرائش تھی اور وہ تصویر میں بھی عریاں نظر آنا چاہتا تھا۔

غیر معمولی جذبہ رکھنے والے لوگ پھر راحت و آرام اور مصلحتوں کا زیادہ خیال نہیں رکھتے ہیں اور نہ آج رکھتے ہیں۔

شعر نمبر (۲) زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب

تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

مشکل الفاظ:

زخم: مراد زخمِ عشق

داد دینا: انصاف کرنا

تنگیٔ دل: دل کی تنگی، وہ تنگی کہ اس میں کسی بات کی کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔

سینۂ بسمل: زخمی انسان کا سینہ، پھڑپھڑاتا ہوا

پَر افشاں: تیزی سے بازوؤں کو حرکت دینے والا، پریشانی کے عالم میں اڑنے والا

تشریح:

میں اپنے حالات سے اتنا دل تنگ ہوں، غیر مطمئن ہوں کہ اب کوئی صورت میرے دل میں خوشی کا احساس پیدا کرنے اور کھلا پن محسوس کرنے کی باقی ہی نہیں رہی۔ یہاں تک کہ میرے دل میں جو تیر لگا، اس کا زخم بھی میری دل تنگی کے مقابلے میں بہت معمولی تھا۔ اس میں کوئی وسعت ہی نہیں تھی۔ اور کچھ نہیں تو یہ زخم تیر کے بجائے تلوار کا ہوتا اور اس طرح میرا دل کشادہ ہو جاتا اور دل تنگی و افسردگی کا ماحول ختم ہو جاتا۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

شعر نمبر (۳) بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مشکل الفاظ:

بوئے گل: پھولوں کی خوشبو

نالۂ دل: دل کی وہ آواز جس میں فریاد چھپی ہو

دودِ چراغِ محفل: چراغِ محفل کا دھواں

بزم: محفل، انجمن

تشریح:

اردو شاعری میں کچھ الفاظ ترکیبیں ہوتے ہیں اور ہماری تہذیبی فکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلے مصرعے میں آئے ہوئے تین لفظی ترکیبیں ہیں۔ یعنی دل کی فریاد، پھولوں کی خوشبو اور چراغِ محفل کا دھواں۔ کہیں محفل ہوگی تو خوشبوئیں بھی ہوں گی اور چراغِ محفل سے اٹھنے والا دھواں بھی۔ قدیم زمانے کے اعتبار سے چراغ یا پھر شمع کا ذکر کر سکتے ہیں اور ان میں سے ہر شے کا ، ہر جذبے کا ہماری محفلوں سے ایک گہرا رشتہ ہے اور جب یہ محفل درہم برہم ہوتی ہے تو ہم ایک گہرا دکھ محسوس کرتے ہیں۔ اسی کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے اور محبوب کی محفل سے اٹھنا، اٹھ کر جانا اور رخصت ہونا دل پر کتنا بڑا بوجھ بنتا ہے اسی کے لیے پریشان ہو کر نکلنا اور نکل کر پریشان ہونا کہا گیا ہے مگر اس میں بے آبروئی شامل نہیں ہے۔ یہ پورا شعر علامتی ہے۔

شعر نمبر (۴) دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد

کام یاروں کا ، بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

مشکل الفاظ:

دل حسرت زدہ: حسرتوں کا مارا ہوا دل

مائدہ: دسترخوان جس پر طرح طرح کی چیزیں اور کھانے پینے کی اشیا سجی ہوئی ہوں۔

یاروں: سے مراد ہم یا ہم جیسے لوگ

کام نکلا: مگر حسب ضرورت کام نکلا

بہ قدرِ لب و دنداں: لبوں اور دانتوں کی ضرورت کے مطابق

تشریح:

پہلے زمانے میں یا آج کے زمانے میں تہذیبی تقاضا یہ تھا کہ دسترخوان کو وسیع کیا جائے اور خوب سجایا جائے۔ مقصد خاطر تواضع بھی ہوتا تھا اور اپنی خوش دلی اور اپنے حالات کی عمدگی کا اظہار بھی۔ چاہے یہ تمام نمائش تکلف ہی سے کیوں نہ ہو۔ اسی حوالے سے غالب نے یہاں اپنی ایک بات کہی کہ میرا

دل جو ہزار آرزوؤں اور حسرتوں سے بھرا تھا وہ تو ایک بڑا دسترخوان تھا، سجا ہوا دسترخوان۔ اب اس سے کون کتنا فائدہ اٹھا سکا یہ الگ بات ہے اور خود ہم اپنی صلاحیتوں کو یا اپنے دلی جذبات کو کہاں تک صحیح استعمال کر سکے اور ان سے کام لے سکے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

آدمی اپنی سماجی زندگی میں کبھی کبھی دوسروں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر لوگ اس سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اس میں ان کی اپنی صلاحیتوں کو بھی دخل ہوتا ہے اور نیتوں کو بھی۔ اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غالبؔ نے انھیں سماجی رزائیوں کی طرف علامتی انداز میں اشارہ کیا ہے۔

شعر نمبر (۵) تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند

سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

مشکل الفاظ:

نو آموز: نیا سیکھنے والا

فنا: صوفیوں کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہوتے ہیں اپنی شخصیت اور نجی شعور ذات کو خدائی حقیقتوں میں گم کر دینا جسے وہ فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فنا فی اللہ یا فنائے ذات ایک مشکل مرحلہ ہے جس کے تمام نکتوں کو عام آدمی سمجھ بھی نہیں سکتا اور ایک عام طالب علم بھی۔ اس لیے کہ درس لینے کی ابتدائی منزل میں آدمی سب کچھ نہیں جان سکتا۔

ہمت دشوار پسند: وہ حوصلہ جو مشکلات کو پسند کرتا ہو اور وہ ہمت جو امتحانات سے گھبراتی نہ ہو جسے آزمائشوں میں پڑنا پسند ہو۔

تشریح:

ہماری طبیعت بہت ابتدائی مرحلوں میں بھی بہت حوصلہ مند اور دشوار پسند تھی۔ فنا کی منزل سے گزر جانا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے لیے یہ ایک مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اب ہم کیا کریں۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم مشکلات سے بھی نہیں گھبرائے۔ اب کس کا حوصلہ کریں اور کیا کریں۔

یہی تو سخت مرحلہ ہے۔ مشکل پیدا کرنے والا مرحلہ۔ انگریزی کا مقولہ ہے:

"What to be and what not to be that is the difficulty."

غالب بھی ذاتی طور پر اپنے آپ کو ایسے ہی کسی مرحلے میں پاتے ہیں۔

شعر نمبر (۹) دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب

آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

مشکل الفاظ:

گریہ: رونا قطرہ: بوند مراد قطرۂ اشک

تشریح:

اے غالب پھر رونے کی شدید خواہش نے زور پکڑا ہے اور خیالِ گریہ نے میرے دل میں ایک طوفان اٹھا دیا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ایک بار میں دل بھر کر رو لیا تو اب مجھے جوشِ گریہ سے نجات مل گئی، مگر معاملہ تو اس کے برعکس نکلا اور کوئی قطرۂ آنسو کی بوند کی صورت میں میرے دل میں رہ گیا ہوگا، اس نے طوفان برپا کر دیا۔ غالب کے یہاں اس طرح کی بازگشت کا تصور بہت ملتا ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

غزل نمبر:۵

وحشی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی؟ کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

شعر نمبر(۱):وحشی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

مشکل الفاظ:

باب: لائق

نبرد: جنگ وجدال،مقابلہ،معرکہ آرائی

نبرد پیشہ: جو معرکہ آرائی یا جنگ وجدال کو اپنا پیشہ بنالے

مرد: صاحب ہمت،مردانہ خصوصیات والا،حوصلہ مند

تشریح:

جو لوگ ہمت والے حوصلے والے نہیں ہوتے وہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ تو ایک دھمکی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کا دم نکل جاتا ہے۔ جب کہ عشق تو بڑی ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے اور یہ کسی ایسے شخص ہی میں ہو سکتا ہے جو اعلیٰ درجے کی مردانہ خصوصیات رکھتا ہے۔

شعر نمبر (۲) تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی میرا رنگ زرد تھا

مرگ کا کھٹکا: موت کا خطرہ زندگی بھر ساتھ رہا

پیشتر: پہلے بلکہ بہت پہلے

رنگ زرد ہونا: محاورہ ہے جس کے معنی چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے۔ جو خوف کے باعث ہوتا ہے۔ رنگ اڑ جانا بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ بھی محاورہ ہے۔

تشریح:

غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک خوفزدہ، بزدل اور کم حوصلہ آدمی کی زندگی بھی کیا، وہ زندہ ہوتا ہے تو بھی مردوں جیسا ہوتا ہے۔ ڈر کے مارے اکثر لوگوں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ مگر ایسے بزدل اور تھڑدل لوگوں کا رنگ تو ویسے ہی اڑا رہتا ہے کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔

غالب اپنے آپ کو ان بزرگوں کی اولاد مانتے تھے جن کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اسی لیے وہ اس بات کو ایک مرد آدمی کی صفت مانتے ہیں کہ وہ خطرات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرے مگر کمزور طبیعت اور بزدل لوگ ایسا کر نہیں پاتے اور مرنے سے پہلے مردہ نظر آتے ہیں۔

شعر نمبر (۳) تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

مشکل الفاظ:

تالیف: جمع کرنا، مرتب کرنا

نسخہ: کتاب، بیاض

مجموعۂ خیال: خیالات کا مجموعہ

فرد فرد: ورق ورق

تشریح:

میں اس وقت عشق، وفا کی باتیں اس طرح کرتا تھا جیسے کوئی مختلف رسائل اور صفحات کو جو ورق ورق ہوں ترتیب دے رہا ہو اور ان سے کتاب دانش تیار کر رہا ہو اور یہ میری اس عمر اور دور زندگی کی بات ہے جب یہ کہئے کہ میں بچہ تھا اور میرے خیالات ایک دوسرے سے جڑے بھی نہیں تھے۔ میں اپنے خیال و خواب کے درمیان کوئی ربط پیدا ابھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر عشق و وفا کی دعویداریاں اس وقت بھی میری زبان پر آتی تھیں۔

شعر نمبر (۳) دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب

اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

مشکل الفاظ:

دل تا جگر: دل سے جگر تک

ساحلِ دریائے خوں: خون کے دریا کا ساحل، کنارا۔ دریا بڑی ندی کو بھی کہتے ہیں اور سمندر کو بھی

رہ گزر: راستہ، اسے رہ گزار بھی کہتے ہیں

جلوۂ گل: پھولوں کی تماشا گاہ، حسین منظر، موسم بہار کا مرقع

آگے: پہلے، یعنی پیشتر، دہلی والے اب بھی گزر جانے والے سال کو اگلا سال کہتے ہیں۔

گرد تھا: گرد ہونا محاورہ ہے اور اس کے معنی ہیں دھندلا، بے رنگ، کم صورت۔

جیسے کوئی کہے کہ وہ اس کے مقابلے میں گرد ہے۔ یعنی کوئی درجہ نہیں رکھتا۔

تشریح:

آج تم میرے دل سے لے کر جگر تک یعنی میرے جذبات، خیالات اور احساسات پر نظر ڈالو تو وہ سارا منظر ایسا نظر آئے گا جیسے دور تک کوئی خون کی ندی بہی جاری ہو اور یہی وہ میری جذباتی دنیا ہے جو کبھی حسن گل اور فضائے گلزار سے زیادہ حسین تھی اور اس پر بہاروں کو بھی رشک آتا تھا۔ یعنی میرے احساسات کی دنیا زیادہ خوب صورت تھی۔ آج کی طرح اجاڑ نہیں تھی۔

شعر نمبر (۵) جاتی ہے کوئی؟ کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

مشکل الفاظ:

اندوہِ عشق: غم محبت، پیار کا غم
کشمکش: کشاکش، کھینچا تانی

تشریح: عشق و محبت کی کشمکش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ عشق خوشی بھی ہے اور غم بھی، سکون بھی ہے اور اضطراب بھی۔ اسی لیے عشق و محبت کے جذبات کو کشمکش سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اگر دل مایوسیوں میں گھر بھی جاتا ہے تو دل کے جانے کا دکھ ہمیشہ رہتا ہے۔ اردو کا یہ شعر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

(میر)

غالب کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شعر نمبر(۲) احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے

زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

مشکل الفاظ:

احباب: حبیب کی جمع، دوست

چارہ سازی: علاج، تدبیر علاج

وحشت: دیوانگی عشق

بیاباں: صحرا، دور تک پھیلا ہوا

نورد: طے کرتا والا، مسلسل چلنے والا، بھٹکنے والا

زنداں: قید خانہ

تشریح: میرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ میرے جنونِ عشق کا کوئی علاج تلاش کرلیں، کوئی ایسی تدبیر کارگر ہو جائے کہ میری وحشت کم ہو جائے۔ مگر ایسی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ مجھے قید خانے میں ڈال دیا گیا مگر پھر بھی بات نہ بنی اور میرے خیالات دیوانوں کی طرح دشت وصحرا میں برابر بھٹکتے رہے۔

غزل نمبر:۲

شمار سبحہ، مرغوب بت مشکل پسند آیا

تماشائے بہ یک کف بردن صد دل، پسند آیا

بہ فیض بے دلی نومیدی جاوید آساں ہے

کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل، آئینہ بے مہری قاتل

کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ

مبارکباد اسد، غمخوار جان درد مند آیا

شعر نمبر (۱) شمارِ سبحہ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا

تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل، پسند آیا

مشکل الفاظ:

شمار: گننا

سبحہ: تسبیح

مرغوب: پسندیدہ، جس کی طرف طبیعت کی رغبت ہو

بتِ مشکل پسند: وہ محبوب یا معشوق جو مشکلات کو پسند کرتا ہو۔ یعنی جو باتیں مشکل ہوں، وہی اس کو پسند ہوں۔

بہ یک کف بُردن: ایک ہاتھ میں لے جانا

صد دل: سو دل

تماشا: عجیب و غریب کھیل

تشریح:

غالب کی طبیعت مشکل پسند تھی۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں خاص طور سے ہوتا ہے اور ان کے اس رویے میں بھی کہ وہ اپنے محبوب کے جس انداز و ادا کو پسند کرتے ہیں اس میں بھی مشکل پسندی اپنے طور پر موجود ہے کہ وہ تسبیح کے دانوں کو گھماتا رہتا ہے اور ان میں اس حقیقت کا تماشا دیکھتا ہے کہ ہاتھ کے ایک اشارے میں سو دل قابو میں آتے ہیں اور ان کو حسبِ خواہش جنبش دی جا سکتی ہے۔ یعنی محبوب کی پسندیدہ ادا یہ ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے میں سینکڑوں دلوں کو قابو کرنا چاہتا ہے اور یہی چیز اسے تسبیح کے دانوں کے شمار اور ان کی حرکت اپنے میں نظر آتی ہے۔ اس لیے وہ تسبیح پڑھنا پسند کرتا ہے بلکہ اس شغل کو محبوب رکھتا ہے۔

غالب نئی بات کہنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں نئے انداز سے کہنا چاہتے ہیں لیکن بات

کہتے وقت وہ غزل کے نرم و نازک لہجے کا خیال نہیں کرتے اور اس طرح کے شعر کہتے ہیں جن سے ان کے پڑھنے والے یا سننے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور معنی یابی نہیں کر سکتا۔

شعر نمبر (۲) بہ فیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے

کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

مشکل الفاظ:

بے دلی: افسردہ دلی، نا امیدی، احساسِ محرومی اور بے تعلق ہو جانا

بہ فیض: اس کے فیض سے، اس کے سبب سے یا اس کی مہربانی سے

نومیدی: نا امیدی، مایوسی و محرومی کا شدید احساس

جاوید: ہمیشہ رہنے والا، جاوداں

کشائش: کھولنا، کشادہ کرنا، مشکل کو آسان بنانا

عقدۂ مشکل: بہت ہی پیچ دار گرہ، گرہ در گرہ، خم در خم

تشریح:

یہ شعر بھی اس غزل کے بعض دوسرے شعروں کی طرح مشکل پسندانہ ہے اور مشکل کو پسند کرنے کے رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں غالبؔ نے اس ذہنی کیفیت یا نفسیاتی حالت یا پھر نفسیاتی نکتہ پیش کیا ہے کہ انسان جب نا امید ہو جاتا ہے تو پھر گویا اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ نہ وہ کسی سے کوئی توقع رکھتا ہے اور ذہنی طور پر پریشان ہوتا ہے۔ اس طرح سے اس کا مشکل مسئلہ یا گھمبیر پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔

شعر نمبر (۳) ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل

کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

مشکل الفاظ:

سیرِ گل: پھولوں کی سیر

ہوا: خواہش

آئینہ: تصویر دکھانے والا، عکس پیش کرنے والا

بے مہری قاتل: قاتل کے ستم کرنے اور محبت سے بیگانہ ہونے کا ثبوت

انداز: اسلوب، طریقہ، ڈھنگ، رنگ

خوں غلطیدن: خون میں لپٹنا، لتھڑ جانا

بسمل: جس کو ضرب پہنچائی گئی ہو، تیر و تلوار سے زخمی کیا گیا ہو یا چھری سے
ذبح کیا گیا ہو۔

تشریح:

میرا محبوب کھلے ہوئے پھولوں کی سیر سے بے حد خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی یہ ادا معشوقانہ نفسیات، اس بات کا آئینہ ہے یا اس کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اپنے ان بسملوں کو خون میں تڑپتا اور ان کے تمام وجود کو خون آلودہ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اس شعر میں بھی محبوب کی اس خصوصیت ہی کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو دیکھنا اور پسند کرتا ہے جن کو دیکھنا یا برداشت کرنا بھی دوسروں کے لیے بے حد مشکل ہوتا ہے۔

شعر نمبر (۳) جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ

مبارکباد اسد غمخوار جان درد مند آیا

مشکل الفاظ:

جراحت: زخم

تحفہ: کوئی بھی شے جو دوستانہ پیش کش کے طور پر نذر کی جاتی ہے۔

ارمغان: یہ بھی تحفہ ہی ہوتا ہے مگر بیشتر اس تحفے کو کہتے ہیں جو باہر سے لایا جاتا ہے اور مخصوصانہ

تحفے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

الماس: ہیرا جو زخم کو اگر چھو جاتا تو زہر چڑھ جاتا ہے۔

داغِ جگر: جگر کا داغ، جلی ہلی تو اہش، گہری ساہوی

ہدیہ: نذرانہ

غمخوار: غم کھانے والا، ہمدرد

جانِ دردمند: دکھوں سے بھری جان، زخموں سے چور انسانی ذہن

تشریح:

اے اسدؔ مبارک ہو کہ تمھاری روحِ مجروح کا ایک ہمدرد، غمخوار اور مدد کرنے والا بھی آ پہنچا اور جراحتوں کا تحفہ لے کر آیا۔ الماس یعنی ہیرا اس کا ارمغان ہے، اپنے ساتھ لایا ہوا تحفہ ہے اور جگر کا داغ ہدیہ ہے۔ یعنی تمھارے دردمند بھی وہ ہیں جو تمھیں طرح طرح سے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

یہ زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان جن سے کوئی توقع رکھتا ہے وہی تو اس کو تکلیف دیتے ہیں، زخم پہنچاتے ہیں، زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں اور دلوں کو داغ دیتے ہیں۔

اسدؔ تخلص سے غالبؔ نے جو غزلیں لکھی ہیں وہ بیشتر مشکل ہیں اور ان میں بیان کی پیچیدگی بھی ہے اور خیالات کی مشکل گری بھی۔ ان میں سے کچھ اچھی ترکیبیں تو ضرور شامل ہیں لیکن غزلیہ شاعری کا یہ اچھا نمونہ نہیں ہیں۔

غزل نمبر ۷

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

شعر نمبر (۱) دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مشکل الفاظ:

دہر: زمانہ

نقشِ وفا: وفاداری کا ایسا اظہار جو دل پر نقش ہو جائے۔ غالبؔ نقش کے خاص معنی لیتے تھے اور اس سے مراد خیالات کا مرقع ہوتا ہے جو کسی شے کے بارے میں ہم رکھتے ہیں۔ اسی

لیے نقش وفا کہا گیا ہے۔ یعنی وفاداریوں کا مرقع۔

شرمندۂ معنی: شرمندۂ معنی ہونا اپنی جگہ لیکن شرمندۂ معنی نہ ہونا سے مراد یہ ہے کہ اس کے کوئی معنی سامنے ہی نہیں آئے۔ وہ تو ایک بے معنی اور لا یعنی لفظ ہے۔

وجہ تسلی: تسلی کا باعث

تشریح:

وفاداری کے اچھے اچھے لفظوں میں مرقعے سامنے آئے لیکن یہ نقش کسی بھی صورت میں وجہ تسلی نہ بنا، اس لیے کہ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ وہ لفظ ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ شرمندہ ہونا محاورہ ہے اور اس کے معنی احسان مند ہونا ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو کسی لفظ کے شرمندۂ معنی نہ ہونے کا ہے۔

شعر نمبر (۳) سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا

یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

مشکل الفاظ:

سبزۂ خط: خوب صورت چہرے پر جوانی کے آثار ظاہر ہونا۔ اس کو سبزۂ خط نکلنا یا سبزہ آغاز ہونا کہتے ہیں۔ یہ تصور ایرانی ہے کہ وہاں برف کا موسم گزرنے کے بعد زمین پر سبزہ اگ آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بہار کے زمانے کا آغاز ہو گیا اور یہ آمدِ بہار کی نشانی ہے۔

کاکلِ سرکش: کاکل لہردار بالوں کو کہتے ہیں جن کو زلفِ خم بہ خم بھی کہا جاتا ہے۔ ایران میں ایسی زلفیں یا گیسو بہت پسند کیے جاتے ہیں جن میں حلقے پڑے ہوئے ہوں۔ کاکل کو سرکش کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سانپوں جیسی سرکشی یا حرکت موجود ہو۔ جو کھٹاؤں میں بجلیوں کے چمکنے سے پیدا ہوتی ہے۔

زمرد: زبرجد۔ سبز رنگ کا پتھر جو ایک طرح سے زہر کا علاج ہوتا ہے اور زہر کو چوس لیتا ہے۔

حریف: مدِ مقابل

دم: سانس

افعی: کالا سانپ

تشریح:

غالبؔ کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب تیرے حسین چہرے پر سبزہ خط نکل آنے پر بھی تیرے گیسوؤں کی سرکشی کم نہ ہوئی جس کے یہ معنی ہیں کہ اب بھی ان سانپوں کے زہر کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ ایرانی تصورات حسن کی ترجمانی کرنے والا شعر ہے کہ عام خیال ہے کہ سبزۂ آغاز ہونے کے بعد محبوب کے حسن کی دل کشی میں کمی آجاتی ہے اور زلفوں کے خم اتنے پر کشش نہیں رہ جاتے جتنے اس سے پہلے ہوتے ہیں۔

شعر نمبر (۳) میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

مشکل الفاظ:

اندوہ: غم، اداسی

ستمگر: ستم کرنے والا یعنی محبوب

چھوٹوں: رہائی پانا، آزاد ہونا

تشریح:

میرے ساتھ خوبانِ جہان میں یعنی دنیا میں میرے ساتھ بھی وفا نہیں کی میں محبوب کی وفاداری سے محروم رہا تو میری یہ خواہش ہوئی کہ میں مر جاؤں اور اس غم سے نجات پا جاؤں کہ میرے ساتھ کسی نے وفاداری نہیں برتی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ میرے محبوب کی ادائیں مجھے مرنے بھی نہیں دیتیں۔

شعر نمبر (۴) دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی

گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

مشکل الفاظ:

گزرگاہ: گزرنے کی جگہ

گر: اگر

مے:	شراب	نفس:	سانس
ساغر:	پیالہ، جام	جادہ:	چھوٹا راستہ، پگڈنڈی
خیال:	تصور		سر منزل یعنی منزل
تقویٰ:	پرہیزگاری		

تشریح:

اگر ہماری زندگی پرہیزگاری اور نیکی سے دور رہی تو بھی کیا۔ آزادروی اور رند مشربی میں کیا بُرائی ہے، ہم نے یہ اختیار کر لیا ہے۔

زندگی میں اگر کوئی بڑا اور بہتر کام نہ کیا جا سکے تو اس کی وجہ سے ساری باتوں کو چھوڑ دینا تو مناسب نہیں تو دوسرے راستے پر چلنے میں کیا بُرائی ہے، کوشش تو کی جانی چاہیے۔ فارسی کا ایک مشہور فقرہ ہے: کوشش بیہودہ بہ از خفتگی (سونے سے تو کوئی بے کاری بات بھی بہتر ہے)۔ کہ اگر بڑا کام نہ ہو سکے، چھوٹا کر لیا جائے۔ ایک راہ نہ ملے تو دوسری راہ اختیار کر لی جائے۔ یہی غالب نے کیا بھی ہے اور کہا بھی ہے۔

شعر نمبر (۵) ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی

گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

مشکل الفاظ:

گوش:	کان
منت کش:	احسان مند
گلبانگ تسلی:	تسلی کے الفاظ، جو خوشی کے نغمے کی طرح کانوں میں گونجتے ہیں۔

تشریح:

تو نے وعدہ نہیں کیا، میں اس پر بھی خوش ہوں کہ اس طرح میرے کانوں پر تیرے تسلی دینے والے

لینے کا کوئی احسان تو نہیں ہوا۔ تو اپنا وعدہ پورا کرتا مگر میں تیرا احسان مند ہوتا۔ میرے لیے تو ایک حرف تسلی بھی بڑی بات ہوتی مگر تو نے وہ بھی نہیں کیا۔

شعر نمبر (۲) مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ

ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

مشکل الفاظ:

صدمہ: جذباتی تکلیف

یک جنبشِ لب: لبوں کا ہلا دینا، بات کرنے کا ذرا سا خیال

ناتوانی: کمزوری

حریف: مدِ مقابل، برداشت کرنے والا

دمِ عیسیٰ: حضرت عیسیٰ کا وہ سانس، وہ نفس جس سے مردوں کو وہ زندہ کر دیتے تھے۔

تشریح:

غالبؔ نے اپنی غیر معمولی حسیت کا اظہار کیا ہے کہ میں کسی کا احسان اس لیے نہیں لیتا کہ احسان لینے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ میں نیم مردہ ہوں۔ حد بھر ناتواں ہوں۔ اگر مجھے کوئی زندہ رکھنے کے لیے حضرت عیسیٰ کے معجزے سے بھی کام لے تو مجھے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ میں تو جنبشِ لب سے جو ہوا میں حرکت آتی ہے اسی سے مر جاؤں گا اور زندہ نہ رہ سکوں گا۔ جیسے چراغ کی لو کا سا تا بھی کبھی شعلے کی رمق کا تاب ہو نہ بن جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا کہ میں اپنی کمزوری کے باعث دمِ عیسیٰ کا بھی متحمل نہ ہو سکا۔

غزل نمبر: ۸

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

دکھاؤں گا تماشا ، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل ایک تخم ہے سرو چراغاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے ، خون گرم دہقاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

شعر نمبر (۱) ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

مشکل الفاظ:

ستائش: تعریف

ستائش گر: تعریف کرنے والا

زاہد: متقی ، پرہیزگار، زیادہ عبادت کرنے والا

باغِ رضواں: جنت، بہشت

گلدستہ: بہت سے پھول ایک ساتھ جمع کرکے سجانے کے لیے ان کا گلدستہ بنایا جاتا ہے۔

طاقِ نسیاں: وہ طاق جس میں رکھ کر کوئی چیز آدمی بھول جائے

تشریح:

غالب نے بہشت کا ذکر اکثر پُر مزاح انداز میں کیا ہے جو عام مسلمان رویے کے بہت خلاف ہے۔ مسلمانوں کے عقائدی نظام میں بہشت بہت بڑا حوالہ ہے، جس کی نعمتوں کی کہ بہت بڑی نعمتیں ہیں بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں حوریں ہیں، غلمان ہیں، پھل دار درخت ہیں، باغ باغیچے ہیں اور ان میں بہتی ہوئی نہریں ہیں۔ غالب اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زیادہ تر دین دار لوگ بہشت کی تمنا میں یہاں ساری زندگی عبادت میں گزار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے یہ سب کچھ کیا تو خدا خوش ہوگا اور ان کو بہشت میں جگہ دے گا۔ مگر ہمارا یہ عالم ہے کہ ہم بہشت کو طاقِ نسیاں کا گلدستہ سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ شے جو کوئی طاق میں رکھ کر بھول جائے۔ ہمارے پرانے معاشرے میں پیسے ٹکے بھی طاقوں میں رکھ دیے جاتے تھے اور وہاں رکھ کر ایسا بھی ہوتا تھا کہ پھر وہ یاد نہ آئیں اور آدمی اسے بھول جائے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا تمھیں اتنا دے کہ تم رکھ رکھ کر بھول جاؤ۔

ہم نے اسی طرح بہشت کو بھلا دیا۔

شعر نمبر (۲) بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا

کہ ہر اک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

مشکل الفاظ:

بیداد: ظلم

کاوش ہائے مژگاں: پلکوں کا اپنی کاوش سے دل و جگر میں زخم پیدا کرنا کہ لانبی نوک دار پلکیں دل میں تیروں کی طرح چبھتی اور زخم ڈالتی ہیں جس کو زخمِ عشق یا

زخم شوق کہتے ہیں۔

قطرۂ خوں: لہو کی بوند

مرجاں: ایک سرخ رنگ کا سمندری پتھر۔ اس کو تراش کر تسبیح کے دانے بنائے جاتے ہیں۔

تشریح:

محبوب کی لا ابالی نوک دار پلکوں نے میرے دل پر کیا ستم ڈھائے ہیں اور کیا کیا زخم لگائے ہیں، میں اپنی زبان سے اگر اس کا ذکر کروں تو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ میری آنکھوں سے جو خون کے قطرے یا آنسو ٹپک رہے ہیں اور مسلسل ٹپک رہے ہیں وہ تسبیح مرجاں کے دانے معلوم ہوتے ہیں۔

شعر نمبر (۳) دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغ دل ایک تخم ہے سرو چراغاں کا

مشکل الفاظ:

تماشا: عجیب و غریب کھیل یا منظر نامہ

داغ دل: دل و جگر پر آیا ہوا عشق کا داغ

تخم: بیج

سرو چراغاں: سرو کا وہ درخت جس پر بہت سے چراغ جلا کر جشن منایا جاتا ہے۔ اسی لیے اسے سرو چراغاں کہتے ہیں۔

تشریح:

خوشی کے وقت میں بہت سے چراغ ایک ساتھ جلائے جاتے ہیں، اس کو ہم جشن چراغاں کہتے ہیں۔ غالبؔ نے اپنے دل کے زخموں اور داغوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی کثرت کو سرو پر جلائے جانے والے بہت سے چراغوں سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ زمانے نے اگر مجھے فرصت دی تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ میرے دل میں کتنے داغ ہیں اور ہر داغ ایک تخم ہے جس سے سرو چراغاں جنم لیتے ہیں۔

غالب کی شاعری پر داستانوں کا جو اثر تھا اس شعر میں اس تاثر اور تصور کو ایک منظر نامہ میں پیش کیا گیا ہے۔

شعر نمبر (۴) نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

مشکل الفاظ:

لہو پانی ہونا: یہ محاورہ ہے اور اس کے معنی ہے تمام قوت، خواہش اور خوشی کا احساس محرومی میں بدل جانا۔

قیامت ہونا: بہت بڑی مصیبت ہونا۔ قیامت کا سا ہنگامہ برپا ہونا

سرشک آلودہ ہونا: آنسوؤں سے بھیگ جانا

مژگاں: پلکیں

تشریح:

کسی حسین اور بے حد محبوب شخصیت کی آنکھوں میں آنسو آنا محبت کرنے والوں کے دل پر قیامت گزرنا ہے۔ اسی کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ تیری پلکوں پر آنسوؤں کا امڈ آنا یا تیری پلکوں کا بھیگ جانا نہ جانے کتنے محبت کرنے والوں کے لیے قیامتوں کا سبب بنا ہوگا۔

شعر نمبر (۵) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برق خرمن کا ہے، خون گرم دہقاں کا

مشکل الفاظ:

تعمیر: عمارت، شکل و وجود، کوئی نہ کوئی ایسی صورت جس سے کسی شے کی پہچان ممکن ہو۔

مضمر: چھپی ہوئی

صورت خرابی: وہ صورت جو بگاڑ کی تخریب کی علامت ہو۔

ہیولیٰ: فلسفے کی ایک اصطلاح ہے یعنی کسی تعمیر کا ذاتی خاکہ جس سے آگے بڑھ کر

اس کی کوئی صورت مخفی ہے۔

برق: بجلی

خرمن: ڈھیر جیسے پھولوں کا یا اناج کا

خونِ گرم: گرم خون جس کی وجہ سے آدمی کچھ کر پاتا ہے اور بناؤ یا بگاڑ ممکن ہوتا ہے۔

دہقان: کسان، دیہاتی

تشریح:

میری تعمیر میں خرابی کی ایک صورت بھی چھپی ہوئی ہے اور یہ سمجھئے کہ تعمیر کے ساتھ تخریب اسی طرح ضروری ہے جیسے زندگی کے ساتھ موت، اُجالے کے ساتھ اندھیرا اور وجود کے ساتھ عدم۔ اور اس کا ہم احساس کچھ اس طرح سے بھی کر سکتے ہیں کہ جہاں خرمن ہوگا وہاں بجلی بھی ہوگی۔ اس لیے کہ خرمن کی جو تعمیر ہے برباد کرنے والی شے بجلی ہوتی ہے اور بجلی کو جنم دینے والی حقیقت دہقان کے خون کی گرمی ہوتی ہے۔ اگر دہقان کا گرم خون نہ ہو تو بجلی کہاں سے آئے اور بجلی نہ ہو تو تعمیر میں تخریب کی صورت کیسے پیدا ہو۔ جب کہ تخریب تعمیر کے ساتھ لازمی ہے۔ ہم بجلی کو آسمانی حقیقت سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ گھٹاؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ غالبؔ نے اس کی نئی توجیح کی ہے۔ وہ اس کا سبب دہقان کے خونِ گرم کو کہتے ہیں کہ اس کی پیدا کی ہوئی قوت سے کھیتی باڑی بھی جنم لیتی ہے اور بجلیاں بھی۔ تعمیر کا سبب بھی وہی ہے اور تخریب کا سبب بھی۔ یہی غالبؔ کہنا چاہتے ہیں کہ شمع کا وجود شعلے سے ہے اور شعلہ ہی اس کے موم کو پگھلا کر اس کے وجود کو عدم میں بدل دیتا ہے۔

شعر نمبر (۶) نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

مشکل الفاظ:

جادہ: پتلی، چھوٹی سی سڑک

راہِ فنا: فنا کا راستہ، موت کی راہ

شیرازہ: بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کرنا۔ جُز بندی، جیسے کتاب کی شیرازہ بندی۔ خیالات کی شیرازہ بندی اور موسیقی میں اصوات کی شیرازہ بندی۔

عالم: دُنیا

اجزائے پریشاں: دُنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء

تشریح:

زندگی موت کے راستے کا سفر ہے اور موت ایک ناقابلِ انکار حقیقت۔ ہم ہر شے کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر موت کو نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ موت اجزائے حیات کو بکھیر دیتی ہے۔ غالبؔ نے دوسری بات کہی کہ زندگی ان اجزائے پریشاں کا شیرازہ ہے جن کا مقدر بکھر جاتا ہے۔ اسی لیے یہ راہِ حیات اجزائے پریشاں کا گویا شیرازہ ہے، ان کی عارضی سلسلہ بندی ہے۔

غزل نمبر ۹

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ

سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

شعر نمبر(۱) محرم نہیں ہے تو ہی نواے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

مشکل الفاظ:

محرم: واقف، جس سے پردہ نہ ہو

محرمِ راز: راز کو جاننے والے

نواہائے راز: بھیدوں سے بھرے ہوئے نغمے

حجاب: پردہ، شرم وحیا

پردۂ ساز: یعنی ساز کا وہ پرزہ یا وہ مقام جہاں سے کوئی خاص سُر نکلتا ہے۔

تشریح:

تم خود ہی بھیدوں بھری آوازوں سے واقف نہیں ہو۔ تم انھیں سنتے ہو مگر ان کے معنی تک نہیں پہنچتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جو باتیں بظاہر چھپی ہوئی ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح ہیں جس طرح ساز کے پردوں سے نغمے نکلتے ہیں، اسی طرح یہاں جن چیزوں کو، جن حقیقتوں کو ان کی معنی اور معنویت کے ساتھ پردے میں رکھا گیا ہے وہ بھی بے پردہ ہیں۔ صرف تمھاری نگاہ و تحقیق کی منتظر ہیں کہ تم انھیں دیکھو تو ان کے معنی تم پر ظاہر ہو جائیں اور تم ان کے معنی سے ان کی معنویت تک پہنچ جاؤ۔

اقبال کے یہاں بھی اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے ؂

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو

سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

شعر نمبر (۴) رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

مشکل الفاظ:

رنگِ شکستہ:	اڑا ہوا رنگ، پھیکی پڑ جانے والی رنگت
صبحِ بہار:	بہار کی صبح
نظارہ:	منظر، جلوہ، مرقع
شگفتن:	کھلنا
گلہائے ناز:	ناز و ادا کے پھول

تشریح:

غالبؔ کے اس شعر کو اردو کے ایک اور معروف شعر کے پس منظر میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ شعر ہے۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو

تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

تیرے گیسو کھلے کھلے ہیں، بکھرے ہوئے ہیں اور تیری رنگت پھیکی پھیکی سی نظر آتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ تو رات کو جاگا ہے اور تیری رات انتظار میں گزری ہے۔ تیری صبح کی حالت تیری رات کی کہانی کہہ رہی ہے۔

غالبؔ کے شعر میں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ تیرا اڑا اڑا سا رنگ (جس کو غالبؔ نے رنگِ شکستہ کہا ہے) صبح کے اس نظارے سے کم نہیں ہے جس کو بہار نظارہ کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں، کلیاں چٹکتی ہیں اور نسیمِ صبح کے جھونکے اٹھلاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اے میرے محبوب تجھے اس حالت میں دیکھنا بھی اچھا لگتا ہے کہ تیرے ناز و ادا کے پھول ایک نئے انداز سے شگفتہ ہو رہے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ نے یہ کہا ہے کہ یہ وقت تو میرے شاخِ گل کی طرح شگفتہ ہونے

کا ہے اور ناز و انداز سے اٹھلانے کا ہے۔ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تیرے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور تیرے شاداب چہرے کا انداز بدلا ہوا ہے۔

شعر نمبر (۳) تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز

میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مشکل الفاظ:

سوئے غیر: غیر کی طرف

نظر ہائے: نظر کی جمع (نظریں) فارسی قاعدے سے

مژہ ہائے: مژہ کی جمع یعنی پلکیں

مژہ ہائے دراز: لانبی لانبی پلکیں

تشریح:

یہ شعر محبوب کے تغافل کے خاص انداز کو ظاہر کرتا ہے اور اس کو بھی کہ وہ رقیب کی طرف تو بہت بے تکلفی سے اور تعلق خاطر کے ساتھ دیکھتا ہے اور خود غالب کی طرف اس طرح کہ اس کی لانبی لانبی پلکیں اس کی آنکھوں پر جھکی رہتی ہیں۔ اسی کا شکوہ کرتے ہوئے غالب نے کہا ہے کہ غیر یعنی میرے رقیب کی طرف تو تیری نظریں تیز تیز اٹھتی ہیں، تو خاص توجہ کے ساتھ اسے دیکھتا ہے اور میری طرف اس طرح دیکھتا ہے جیسے دیکھتا ہی نہیں۔ اور تیری لانبی لانبی پلکیں تیری آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھتی ہیں۔

شعر نمبر (۴) صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں

طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

مشکل الفاظ:

صرفہ: فائدہ

ضبطِ آہ: آہ و فغاں کو ضبط کرنا اور خاموش رہنا

وگرنہ: ورنہ

طعمہ: لقمہ

نفس جاں گداز: روح کو پگھلا دینے والا ساز

تشریح:

اگر میں آہ و فریاد نہیں کرتا اور اپنے نالہ و فغاں کو ضبط کیے بیٹھا رہتا ہوں تو یہ اس لیے نہیں کہ میرے دل کو صبر آ گیا ہے اور میری روح کی بے چینیوں کو سکون میسر آ گیا ہے۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنی ناتوانائی اور بے انتہا ضعف اور کمزوری کی بدولت اس لائق ہی نہیں رہا کہ میں آہ بھر کر تجھے یاد کروں یا تیری جدائی میں نالہ کشی کروں۔ میں تو روح کو پگھلانے والے ایک ہی نالہ و فغاں سے جاں بحق ہو جاؤں گا۔

شعر نمبر (۵) ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

مشکل الفاظ:

جوشِ بادہ: شراب کا جوش

گوشہ: کونہ

بساط: قالین، فرش، چاندنی

شیشہ باز: شیشہ اچھالنے والا، جو ایک طرح کی ہنرمندی اور کھیل ہوتا ہے۔

ہیں بس کہ: زیادہ فراوانی کے ساتھ

تشریح:

غالبؔ نشہ شراب کی حالت میں اپنی ذہنی کیفیتوں کو پیش کر رہے ہیں کہ میرے سامنے بساطِ عیش پر شراب کے بھرے ہوئے شیشے رکھے ہیں اور جوشِ بادہ کی بدولت اچھلتے ہوئے یا رقص کرتے ہوئے

نظر آتے ہیں اور سارا عشق کا یہ گوشہ کچھ اس طرح نظر آ رہا ہے جیسے کوئی شیشہ باز اپنے ہاتھوں میں شیشے لیے ہوئے ہو اور ان کو اپنی خاص ہنر مندی سے اچھال رہا ہو۔

شعر نمبر (۹) تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ

سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

مشکل الفاظ:

تاراج: برباد ہونا، لٹ جانا

کاوش: کوشش مراد خلش

غمِ ہجراں: جدائی کا غم

دفینہ: زمین میں دبایا ہوا خزانہ

گہر ہائے راز: راز کے موتی

تشریح:

اے اسدؔ میرا سینہ یعنی میرا دل جو گہر ہائے راز کا خزانہ تھا، اب جدائی کے غموں نے اس کو برباد کر کے رکھ دیا اور اس کی وہ حالت ہو گئی جیسے کسی لوٹ مار کرنے والی فوج نے کسی شہر کو لوٹ لیا ہو اور اس کی شہری فضا کو تہس نہس کر دیا ہو۔

غزل نمبر:۱۰

شب کو برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر ایک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شعر نمبر(۱) شب کو برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر ایک حلقۂ گرداب تھا

مشکل الفاظ:

برق: بجلی

سوزِ دل: دل کی جلن یا دل کی آگ

زہرۂ ابر: بادل کا پتہ، جگر کے ساتھ لگی ہوئی ایک تھیلی جس میں پتے بھرے ہوئے ہوتے ہیں جن کو فن طب کی اصطلاح میں صفرا کہتے ہیں۔ پتہ مارنا اسی پتے سے متعلق ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں برداشت کرنا، ضبط کرنا، صبر کرنا۔

آب: پانی

شعلۂ جوالہ: بھڑکتا ہوا شعلہ

حلقۂ گرداب: پانی میں پڑنے والے بھنور کا حلقہ

تشریح:

رات کو صدمۂ جدائی یا دل کی آگ کے باعث مجھ پر وہ حالت بیت رہی تھی کہ اگر وہ بادل پر بیت جائے تو اس کا پتہ پانی ہو جائے۔ جس طرح بجلی خود آگ ہے لیکن بادل کے پتے کو وہ پانی کر دیتی ہے، اسی طرح محبوب سے جدائی کی آگ میرے دل و جگر کو پانی بنائے دے رہی تھی اور میری آنکھوں میں طوفان امڈ رہا تھا اور اس طوفان میں جو پانی کے بھنور پڑ رہے تھے وہ شعلۂ جوالہ معلوم ہو رہے تھے۔ یعنی جوش کھاتا اور گھومتا ہوا شعلہ۔

بجلی، بادل اور پانی کا تعلق اگرچہ فطری ہے، سائنسی ہے لیکن غالب نے اس تصور اور تصویر سے ایک طرح کا مبالغہ پیدا کیا ہے جس کا تعلق ان کے جوشِ گریہ سے ہے۔

شعر نمبر (۲) واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام

گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

مشکل الفاظ:

واں: وہاں

کرم: ہمدردی، محبت اور خلوص

عذرِ بارش: بارش ہوتے رہنے کا عذر

عناں گیر: باگ پکڑنے والا، روکنے والا

خرام: آہستہ آہستہ نازک انداز سے چلنا

گریہ: رونا، آنسو بہانا، جوش گریہ بے طرح آنسو امڈ آنا

پنبۂ بالش: تکیے کی روئی

کف سیلاب: پانی میں تیرتے ہوئے جھاگ۔ کف ہتھیلی کو بھی کہتے ہیں

تشریح:

میرا محبوب اس خلوص، اس محبت اور مہربانی کرنے کی عادت کے باعث میرے پاس آنا چاہتا تھا، لیکن طوفانی بارش اسے آنے سے روک رہی تھی اور گویا اس کے گھوڑے کی لگام روکنے کی غرض سے پکڑے ہوئے تھی۔ اور یہاں یہ عالم تھا کہ اس بُری طرح آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا کہ میرے تکیے کی روئی اس میں جھاگ کی طرح تیر رہی تھی۔

شعر نمبر (۳) واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال

یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

مشکل الفاظ:

خود آرائی خود کو سنوارنے کا عمل جس کو محاورے میں بال بال موتی پرونا کہتے ہیں

ہجوم اشک: آنسوؤں کا ہجوم، ایک ہیجانی اور طوفانی کیفیت

تار نگہ: نگاہ کا تار، دیکھنے کی قوت

نایاب: نہ ملنے والی شے جو بہت ہی کمیاب ہو

تشریح:

وہ اپنی آرائش و زیبائش میں لگے ہوئے تھے اور خود آرائی کے خیال سے بال بال موتی پرونے کا عمل جاری تھا اور یہاں اس کے انتظار اور جدائی کے صدمات کی بدولت آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ ایسا کہ میں اب اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

کلاسیکی اردو شاعری میں جو تصورات بار بار آتے رہے ہیں اور حسن و جمال کی تصویر پیش کرتے رہے ہیں ان میں محبوب کی خود آرائی کا تصور بھی شامل ہے۔ آرائش و زیبائش عورت کا اپنا مزاج بھی ہے اور محبوب کا شیوہ بھی۔ اس لیے مختلف شاعروں کے یہاں خود آرائی کے سلسلے میں شعر ملتے ہیں۔ ایک شعر یہ بھی ہے۔

دیر لگ جائے بلا سے انھیں آرائش میں
رہ نہ جائے کسی کمبخت کا ارماں کوئی

شعر نمبر (۳) جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

مشکل الفاظ:

جلوۂ گل: پھولوں کا کھلنا۔ ان کا رنگ روپ۔ ان کا حسن و جمال

چراغاں: بہت سے چراغوں کا ایک ساتھ جلنا

آب جو: چھوٹی سی خوب صورت نہر جو امیروں اور خاص طور پر شاہی محلوں سے ہو کر گزرتی تھی۔

رواں: بہتا

مژگاں: مژہ کی جمع یعنی پلکیں

چشم تر: بھیگی ہوئی آنکھیں

خون ناب: خالص خون

تشریح:

اس شعر کا ذہنی پس منظر بھی وہی ہے جو اس سے پہلے آنے والے شعروں میں موجود ہے کہ پھولوں کی کثرت میں چھوٹی سی خوب صورت نہر کو اپنے روشن رنگوں سے ایسا سجا رکھا تھا جیسے اس کے کنارے چراغاں کر دیا گیا ہو۔ ادھر میرا محبوب اس سے لطف لے رہا تھا اور دوسری طرف میں جدائی کے

صدمے سہہ رہا تھا۔ اور میری پلکوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ ہمارے یہاں رونے کے ساتھ خون کے آنسوؤں سے رونا بھی شامل ہے جس کا ذکر ہمارے شعراء کے یہاں اکثر آتا ہے۔

شعر نمبر (۵) یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی

جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

مشکل الفاظ:

نفس: سانس

شمع بزم بے خودی: بے خودی کی محفل کی شمع

بساط: مسند فرش، بچھونا

صحبت احباب: دوستوں کی صحبت

تشریح:

اُدھر دوستوں کی محفل تھی۔ پھولوں کے گلدستے تھے اور ان سے اڑتی ہوئی خوشبوئیں اور بکھرتی رنگینیاں اور رعنائیاں تھیں اور یہاں اس کی جگہ بے خودی کی محفل تھی۔ تنہائی کا ماحول تھا اور میری سانسیں اس محفل کی جو اجڑی ہوئی دنیا کی مثال تھی، شمع کی طرح روشن کیے ہوئے تھیں۔

ہم اس شعر کو اردو کے اس شعر کی روشنی میں بھی سمجھ سکتے ہیں۔

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک

اجڑے ہوئے گھر میں جلے ہے چراغ ایک

وہاں بزم ہے شمع ہے یہاں اجڑا ہوا گھر اور اس میں جلتا ہوا چراغ۔

شعر نمبر (۶) فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

مشکل الفاظ:

فرش: زمین

موجِ رنگ: رنگینیوں اور رعنائیوں کی لہر

عرش: آسمان

سوختن جل جانے کو

باب: معاملہ، داستان، کہانی

تشریح:

وہاں رنگ و بو، رونقوں اور روشنیوں کا ایک طوفان برپا تھا اور زمین سے آسمان تک شمع و چراغ روشن تھے اور یہاں اس کے مقابلے میں جیسے آگ لگ چکی تھی اور ہر شے جل کر راکھ ہوئی جا رہی تھی۔

شعر نمبر (۷) ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا

دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

مشکل الفاظ:

ناگہاں: اچانک

خوں ناب: وہ پانی جس میں خون شامل ہو یا خون ناب خالص خون

ذوقِ کاوش: ناخنوں سے جگر کو زخمی کرنے کا شوق

لذت یاب: لطف اُٹھانے والا

تشریح: اچانک اس انداز سے میرا دل، جگر خون کے آنسو ٹپکانے لگے۔ اس لیے کہ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں اپنے جگر میں نشتر چبھوؤں اور اپنے دل کو زخمی کر دوں۔

غالب کی یہ غزل کسی قصیدے کی تمہید معلوم ہوتی ہے اسی لیے اس کی گریز کا شعر ناگہاں سے شروع ہو رہا ہے۔

غزل نمبر:۱۱

نالۂ دل میں شب، انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر گو بے تاب تھا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

نازش ایام خاکستر نشینی، کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا

کچھ نہ کی، اپنے جنون نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدۂ بے تاب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کا سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

شعر نمبر(۱) نالۂ دل میں شب، انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر گو بے تاب تھا

مشکل الفاظ:

نالۂ دل: دل سے نکلی ہوئی فغاں و فریاد

انداز اثر: اثر کا انداز

شب: رات

نایاب: نادر

سپند: کالا دانہ جو کسی کو بُرے اثر سے بچانے کے لیے آگ پر جلایا جاتا ہے۔

بزم: محفل

وصلِ غیر: رقیب کی ساتھ محبوب کی ملاقات

بے تاب: بے قرار، بے چین، بے سکون

تشریح:

رات میرے لیے جدائی اور تنہائی کے صدموں سے بھری ہوئی تھی اور میرے دل سے نالے نکل رہے تھے۔ لیکن ان فریادوں اور نالوں میں کوئی اثر تھا ہی نہیں اور میرا دل بے تاب جو آتشِ ہجر سے جل رہا تھا، اس کے کوئی معنی اس کے علاوہ نہ تھے کہ وہ میرے رقیب کی انجمن شوق کو بُرے اثرات سے بچانے کے لیے سپند کی طرح جلایا جا رہا تھا یعنی میرا محبوب رقیب کے ساتھ تھا اور میں جدائی کے شعلوں میں جل رہا تھا اور میرے دل کا جلنا بھی گویا رقیب کی محفل کی رونق بڑھا رہا تھا۔ اردو کا ایک شعر ہے ۔

جو چراغوں کا مقدر ہے وہی اپنا ہے
ہم تو جلنے کے لیے رونقِ محفل ٹھہرے

شعر نمبر (۲) مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے

خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مشکل الفاظ:

مقدم: خیر مقدم، استقبال

سیلاب: پانی کا طوفان

نشاط آہنگ: وہ نغمہ دل کے ساتھ خوشیاں روح پر چھا جائیں

خانۂ عاشق: عاشق کا گھر

سازِ صدائے آب: جلترنگ

ساز: آلِ موسیقی

تشریح:

سیلاب آرہا ہے اور اس کی آواز میرے دل و دماغ کو متاثر کر رہی ہے مگر میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ وہ تو مجھ میں ایک طرح کا احساس مسرت پیدا کر رہا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس سیلاب کی وجہ سے میرا گھر خود ہی جلترنگ بن گیا ہے۔ غالب میں خود اذیتی، اپنے آپ کو تکلیف دینا اور تکلیف میں ہونے کے باوجود خوش ہونا ایک خاص رجحان تھا۔ یہ شعر اسی کا ترجمان ہے کہ سیلاب کی آوازیں آرہی ہیں تو میں اس پر خوش ہو رہا ہوں۔ جیسے یہ صدائیں میرے لیے جلترنگ کا وجد رکھتی ہیں۔

شعر نمبر (۳) نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

مشکل الفاظ:

نازشِ ایام: ان دنوں کو یاد کر کے جی کتنا خوش ہوتا ہے، ناز کرتا ہے۔

خاکستر: راکھ، جلی ہوئی مٹی

خاک نشینی: مٹی کو بستر بنانا

پہلوئے اندیشہ: خیال کا پہلو

بسترِ سنجاب: ایک قیمتی کپڑے کا بستر جس کو سنجاف کہتے ہیں۔

تشریح:

کہتا ہے کہ میں وہ زندگی گزار کر آیا ہوں جب کہ خاک نشینی میرا مقدر بنا ہوا تھا اور میں اس پر اتنا ناز

کرتا تھا کہ جیسے میرے پہلوئے اندیشہ میں خاک، دھول کا بستر نہ ہو بلکہ قیمتی کپڑے کا گدا ہو۔ جس پر میں شان سے لیٹا یا بیٹھا ہوں۔ وہی وجہ ہے کہ غالب اپنی بربادی اور تباہی کے دنوں کو بھی یاد کر کے ان پر غم زدہ نہیں ہوتے، خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ یہاں ناز کرنا فخر کرنے ہی کے معنی میں آیا ہے۔

شعر نمبر (۴) کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں

ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

مشکل الفاظ:

جنونِ نارسا: وہ جنون کی حالت جس میں آدمی کچھ کر نہ سکے اور مجبور ہو کر رہ جائے۔

روکش: مدِ مقابل

خورشید عالم تاب: دنیا کو چمکانے والا سورج

تشریح:

میرے جنونِ محبت ہی نے کچھ نہ کیا اور ہم محروم و ناکام رہے۔ ورنہ یہاں صحرا تو بڑی چیز ہے، اس کے ذرے بھی دنیا کو چمکانے والے سورج سے کم نہ تھے، ہم سے ہی کچھ نہ ہو سکا۔

شعر نمبر (۵) آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے

کل تلک تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا

مشکل الفاظ:

اسیر: قیدی

پروا نہ ہونا: بے توجہ ہونا، تغافل برتنا

مہر و وفا کا باب: عشق و وفا کا ایک در، یا Chapter

تشریح:

آج تو اپنے محبت کرنے والوں سے اتنا غافل کیوں ہو گیا ہے، ورنہ تیرا دل تو کل تک مہر و محبت اور عشق

وفا کا ایک مرقع یا ایک صحیفہ تھا، داستان تھا۔

شعر نمبر (۶) یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے تاب تھا

مشکل الفاظ:

حلقۂ دام: جال کا حلقہ، چھوٹے چھوٹے گھیرے جو جال میں ہوتے ہیں۔

انتظارِ صید: شکار کے انتظار میں بیٹھے رہنا

صید: شکار

دیدۂ بے خواب: جاگتی ہوئی آنکھیں جو کسی کا انتظار کر رہی ہوں

تشریح:

اے میرے محبوب مجھے اس بات کا شکوہ ہے کہ تو نے وہ دن بھلا دیے، جب تجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا تھا اور تیری آنکھیں ایک محروم شکاری کی طرح شکار کے انتظار میں کھلی رہتی تھیں۔ جیسے اس شخص کی آنکھیں ہوں، جسے نیند نہ آتی ہو۔

شعر نمبر (۷) میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے

اس کا سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

مشکل الفاظ:

سیلِ گریہ: آنسوؤں کا جوش جو آنکھوں سے ابلے پڑتے ہوں

گردوں: آسمان

کفِ سیلاب: سیلاب کے پانیوں کی جھاگ

تشریح:

میں نے غالب کو دیکھا جو بے طرح رو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے طوفان امڈ رہے تھے

اور یہ صورت بنی جا رہی تھی کہ اس طوفان میں آسمان جھاگ کی طرح بہہ جائے۔

یہ شعر اسی مفہوم کا ہے جو غالب نے اس انداز سے کہا۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غزل نمبر:۱۲

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

شعر نمبر(۱) ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مشکل الفاظ

مژگاں: مژہ کی جمع، پلک

خونِ جگر: دل جگر میں بھرا ہوا لہو

ودیعت: کسی کی عطا کردہ، بخشا ہوا

تشریح:

جو کچھ میرے پاس ہے وہ خونِ دل یا کلیجے کے لہو کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ بھی جیسے مژگانِ یار کا عطیہ تھا کہ مجھے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑا۔ یہاں غالبؔ نے ودیعت کے معنی عطا و بخشش کے نہیں لیے امانت کے لیے ہیں۔ مگر ایک ایک قطرے کا حساب دینا نہ بخشش کے ذیل میں آتا ہے نہ امانت کے۔ امانت کو تو جوں کے توں واپس لوٹایا جاتا ہے۔ حساب دینے کا اس میں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ تو قرض چکانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یہی غالبؔ کے ذہن پر سوار رہتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے یہاں ایک ایک قطرے کا حساب دینے کی بات کی ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ عشق کرنے والے کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، ان کا اپنا نہیں ہوتا، ان کے محبوب یا معشوق کی دین ہوتا ہے اور اسے وہ بھی اس طرح واپس کرتے ہیں جیسے محبوب کی امانت کو واپس کر رہے ہیں۔

شعر نمبر (۴) اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

مشکل الفاظ:

تمثیل: جس آئینے پر نقش بنائے گئے ہوں۔ ڈیزائن تو بنائے جا سکتے ہیں مگر آئینے پر نقش نہیں ہوتے۔ غالبؔ نے کچھ ایسی ہی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کو تمثال دار کہا ہے۔

ماتم: ملال، موت پر پرسا دینا

یک شہرِ آرزو: آرزوؤں کی وہ دنیا جسے ایک شہر کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ہزاروں تمناؤں، خواہشوں اور خوشیوں سے بھری ہوئی کوئی بستی آبادی۔ ایسے کسی تصور کے لیے شہرِ تمنا بھی کہا جاتا ہے۔

تشریح:

غالبؔ کے زمانے میں یا اس سے پہلے دور کی تاریخ میں شہر کے شہر لٹ جاتے تھے، برباد کر دیے جاتے تھے۔ اسی کو غالبؔ نے اپنے ذہن میں رکھا ہے اور کہا ہے کہ اے میرے محبوب تو نے میرا دل نہیں توڑا ہے بلکہ ایک شہرِ آرزو کو برباد کیا ہے اور میں اب اس کا ماتم دار ہوں۔ اس مضمون کو غالبؔ نے ایک خط میں بھی ادا کیا ہے کہ ایک ہی عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو زندگی اس کو کیوں کر نہ دشوار ہو۔ شہروں کی بربادی و تباہی کا ذکر ہماری شاعری میں آتا رہا ہے۔

شعر نمبر (۳) گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں

جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

مشکل الفاظ:

نعش:	لاش، مردہ جسم
جاں دادہ:	جان دینے والا، جان دیا ہوا۔ یعنی وہ جس نے خود کو کسی کے لیے قربان کیا ہو۔
ہوا:	خواہش
رہ گزر:	راستہ
سر:	کنارا بھی ہیں جیسے سرِ شام، سرِ راہ، سرِ منزل جیسی ترکیبیں اردو شاعری یا ادبی زبان میں رائج ہیں۔

تشریح:

اب میری لاش کو شہر کی گلیوں میں کھینچتے ہوئے پھرو کہ میں نے شہر کے مختلف علاقوں میں چکر لگانے کی تمنا میں اپنی جان دے دی ہے اور زندگی میں میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو موت کے بعد ہو جائے۔ ہم اپنے ادب میں اور عام زندگی میں بھی یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ میں نہیں تو میری مردہ لاش ہی وہاں پہنچ جائے۔ اسی کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا ہے۔ علاوہ بریں شہر کی تباہی اور بربادی میں یہ منظر بھی دیکھنے میں آتے ہوں گے کہ لاشوں کو یا کسی لاش کو گلیوں میں کھینچا

جا رہا ہے جو انتہائی تکلیف کی بات ہے لیکن یہ ہوتا رہا ہے۔

شعر نمبر (۴) موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال

ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

مشکل الفاظ:

موج: پانی کی لہر جو ریت کی لہر بھی ہو سکتی ہے اور ہوا کی بھی۔

موجِ سراب: ریت کی لہر کو موجِ سراب کہتے ہیں۔

دشت: صحرا، جنگل، بیابان

دشتِ وفا: وفاؤں کا جنگل۔ یہاں وفا سے مراد یہاں عشق و وفا سے ہے اور عشق کرنے والا اپنی محبت اور تعلق خاطر کو کبھی نہیں بھولتا۔ جب وہ جنگل جنگل پھرتا ہے تو اپنی وفاداری عشق ہی کا اظہار کرتا ہے۔

مثل: طرح، مثال کے طور پر

جوہرِ تیغ: تلوار کی کاٹ یا آب

تشریح:

دشتِ وفا کی سراب جیسی موجوں کا حال کیا پوچھتے ہو کہ یہاں کا تو ہر ذرہ جوہرِ تیغ کی طرح آب دار ہے، کاٹنے والا ہے۔ تلوار کی سب سے بڑی خوبی اس کی آبداری ہوتی ہے۔ اسی کی طرف غالبؔ نے اشارہ بھی کیا ہے کہ دشتِ وفا سے گزرنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔

شعر نمبر (۵) کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب

دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

مشکل الفاظ:

غمِ عشق: عشق کا غم، محبت کرنے والے کی اپنی زندگی کے دکھ

غم روزگار: زمانے کا غم، زمانے کی تکلیفیں

تشریح:

ہم بھی غم عشق کو کم سمجھتے تھے اور غم روزگار سے بچنے کے لیے غم عشق کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ اب وقت پڑ اور زمانے اور معاملات زندگی کا تجربہ ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ غم عشق ایک بہت بڑی بات ہے۔ جان لیوا ہے اور وہ کم ہوتا ہے، گھٹتا ہے اور اس کی شدت باقی نہیں رہتی تو پھر وہ غم روزگار بنتا ہے۔ وفاداری بہت بڑی چیز ہے اور دنیاداری کمتر درجے کی چیز ہے۔

غزل نمبر ۱۳

شب، خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دوعالم دشت کا شیرازہ تھا

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراق لخت دل بہ باد
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

شعر نمبر (۱) شب، خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

مشکل الفاظ:

شب: رات خمار: نشہ

شوق ساقی: ساقی کا اشتیاق رستخیز: قیامت

اندازہ: انداز رکھنے والا صورت خانہ: صورت کدہ، تصویر خانہ

تا: تک یا تلک محیط بادہ: شراب کا حلقہ

محیط: سمندر کو بھی کہتے ہیں اور گول دائرے میں کھینچے ہوئے خط کو بھی یعنی احاطہ کرنے والا۔

خمیازہ: انگڑائی

تشریح:

رات شراب کا خمار چھایا ہوا تھا، آنکھیں نشہ آلود تھیں، انگڑائیاں آ رہی تھیں اور نشے کے ٹوٹنے کی کیفیت دیدہ و دل پر ایک قیامت برپا کر رہی تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سامنے جام شراب رکھا ہوا ہے۔ حسین و جمیل ساقی کی صورت نگاہوں کے سامنے ہے اور جام شراب کے خطوط آتی ہوئی موج شراب محبوب کی انگڑائی کی تصویر ہے بلکہ تصویر خانہ ہے جو نگاہوں کے سامنے ہے اور دل و دماغ پر ایک حسین خواب جیسا منظر چھایا ہوا ہے۔

شعر نمبر (۲) یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا

جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مشکل الفاظ:

یک قدم: ایک قدم

وحشت: جنون، بے خودی کا عالم

درس: سبق

دفتر امکاں: دفتر یعنی کتاب، رجسٹر۔ یعنی دو دو عالم کا دفتر جس کو عالم امکان کی تنظیم و ترتیب کہنا چاہیے

جادہ: پتلا، چھوٹا سا تنگ راستہ جو ریگستان یا جنگل بیابان میں پیدل چلنے سے بن جاتا ہے۔

اجزائے دو عالم: دونوں عالموں کی مختلف جزئیات۔ الگ الگ بہت سی باتیں

دشت: ریت کا میدان، ویران یا بھوز جنگل

شیرازہ: منتشر اجزا کو یکجا کرنا، بکھری ہوئی سچائیوں کو سمیٹنا۔ جیسے کتاب کے مختلف اجزا کو ایک ساتھ ملانے اور جمع رکھنے کے لیے شیرازہ بندی کی جاتی ہے

تشریح:

یہ شعر غالبؔ کے مشکل اشعار میں سے ہے جس میں غالبؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے طلسم کی سیر عقل و خرد، ہوش اور دانشمندی کے سہارے کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ تو صرف جنون عشق کی طرف قدم بڑھانے سے ممکن ہو سکتا ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ دشت بلا، اسے طلسم خانۂ دنیا کہا جاتا ہے، یہ تو بہت سی سچائیوں کا مجموعہ ہے مگر ان سچائیوں کا جو بے طرح بکھری پڑی ہیں اور جن کو فکر میں سمیٹنا بھی آسان نہیں ہے۔

اسی مضمون کو خواجہ میر دردؔ نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

پردے کو تعین کے در دل سے ہٹا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

غالبؔ کی شاعری پر اردو کی داستانوں اور طلسم بندیوں کا جو اثر ہے اور جس سے انھوں نے حکیمانہ نکتے اخذ کیے ہیں، یہ شعر ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شعر نمبر (۳) مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے

خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

مشکل الفاظ:

مانع: منع کرنے والا، روکنے والا

وحشت خرامی: محبت کی دیوانگی میں اِدھر اُدھر بھٹکنا اور جدھر چاہے قدم اُٹھانا۔

لیلیٰ: روایتی کردار، مجنوں کی معشوقہ

خانہ: گھر

مجنوں: مجنوں جس کا نام قیس عامری تھا اور جو بنو عامر قبیلے کا کوئی شخص تھا جو لیلیٰ پہ بے طرح عاشق تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے فرہاد شیریں سے والہانہ عشق کرتا تھا اور اسی کے عشق میں اس نے جان دے دی۔

صحرا گرد: صحراؤں میں بھٹکنے والا، دشت نوردی کرنے والا۔

بے دروازہ: وہ مکان جس کے گرد نہ چار دیواری ہو اور نہ کوئی دروازہ ہو۔

تشریح:

غالب کہتے ہیں کہ جس طرح مجنوں صحراؤں میں بھٹکتا اور دشت و بیابان میں مارا مارا پھرتا تھا، اگر لیلیٰ چاہتی تو اس طرح وہ بھی قدم اُٹھاتی اور مجنوں تک پہنچ جاتی۔ اس لیے کہ مجنوں تو کسی محل میں تھوڑا ہی رہتا تھا۔ وہ تو ایک ایسے ویران جنگل میں رہتا تھا، جہاں نہ کوئی دیوار تھی، نہ کوئی در تھا، نہ کوئی پاسبان تھا جو اسے روکتا۔ معلوم ہوا کہ خود لیلیٰ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجنوں کی طرح عشق کی دیوانگی میں اپنے پاگل پن کے ساتھ اِدھر اُدھر بھٹکے۔ پاگل پن یعنی وحشت، جب آدمی کو اپنے دل و دماغ پر قابو نہ ہو۔ یہ حالت عشق و جنون کے عالم میں ہوتی ہے اور ہماری قدیم شاعری میں اس کا ذکر محبت کی وارفتگی اور والہانہ پن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

شعر نمبر (۴) پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

مشکل الفاظ:

استغنا: بے نیازی، لاپرواہ ہونا

استغنائے حسن: حسن والوں کا انداز بے پرواہی

مرہونِ حنا: مہندی کا احسان مند

رہنِ غازہ: رہن گروی رکھنا اور غازہ چہرے کا پاؤڈر یا غلوہ جس سے چہرہ زیادہ خوب صورت اور دل کش ہو جائے۔

تشریح:

غالبؔ نے اس شعر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ حسن والے اپنے آپ کو بے نیاز اور لا پرواہ ظاہر کرتے ہیں اور یہ دکھلاتے ہیں کہ ان کو کسی چیز کی کیا ضرورت ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ صرف دکھاوا ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے ہاتھ اپنی خوب صورتی کے لیے مہندی کے مرہونِ منت ہیں۔ ان کی دل کشی تمام تر مہندی کے حسن کے باعث ہے اور ان کے رخساروں کی خوب صورتی اور دل آویزی ان کے غازے کی دین ہے۔

یہاں بے نیاز کوئی نہیں ہے۔ سب کو دوسروں کی ضرورت ہے۔ چاہے چیز وں کی ہو یا انسانوں کی۔

شعر نمبر (۵) نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد

یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

مشکل الفاظ:

نالۂ دل: دل کی فریاد

اوراق: ورق کی جمع

لختِ دل: دل کے ٹکڑے

بہ باد: برباد کرنا، ہوا میں بکھیر دینا

یادگارِ نالہ: نالہ و فریاد کی اس دور کی یادگار

دیوانِ بے شیرازہ: وہ دیوان جس کی ترتیب بھی نہیں ہوئی۔ جو ابھی تک جمع بھی نہیں کیا گیا۔

تشریح: غالب نے اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے یا اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے زندگی میں مسلسل آہ و زاری کی۔ وہی آہ و زاری میرے اشعارِ غزل میں ڈھل گئی اور یہ اشعار جن اوراق پہ لکھے تھے ان کو ہوا میں اڑا دیا اور بکھیر دیا۔ اب اس نالہ و فریاد کی یادگار ایک ایسا دیوان ہے جس کی جز بندی اور ترتیب غزلیات بھی نہیں ہوئی۔

غزل نمبر:۱۴

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا؟

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا؟
بلائے جاں ہے اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

شعر نمبر (۱) ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مشکل الفاظ:

ہوس: حد سے بڑھی ہوئی خواہش۔ یہ عام طور پر برے معنی میں آتا ہے۔ لیکن غالبؔ نے اسے شدید خواہش کے معنی میں ضرور استعمال کیا ہے مگر برے معنی میں نہیں۔

نشاطِ کار: کام کرنے کی خوشی

تشریح:

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کام ایک طرح کی غیر ضروری محنت ہے جس سے آدمی کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بات اس پس منظر کے ساتھ تو صحیح ہے کہ پچھلے زمانے میں اور ممکن ہے بعض طبقوں میں اب بھی یہ صورت ہو کہ بیگار لی جاتی ہے۔ تو بیگار کی صورت میں محنت آدمی کے لیے ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ پھر زیادہ محنت بھی آدمی کو تھکا دیتی ہے۔ بعض لوگ اپنی طبیعت کے اعتبار سے کام کرنے کا شوق ہی نہیں رکھتے۔ غالبؔ کے سامنے اس وقت ایسے ہی لوگ ہیں جب وہ یہ شعر کہہ رہے ہیں۔ کہ زندگی میں کام اور مشغولیت تو بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ بے کاری اور بے روزگاری بہت تکلیف دہ حالتیں ہیں اور کاموں کا شوق سے انجام دینا ایک راحت ہے جسے غالبؔ نے نشاطِ کار کہا ہے اور شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک نہایت اہم اور نکتے کی بات یہ کہی گئی ہے کہ زندگی اس لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے کہ موت سر پہ کھڑی ہے۔ اور موت سے زیادہ کوئی شے یقینی نہیں ہے۔ اسی موت کی وجہ سے تو زندگی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اگر موت نہ ہو تو زندگی جینے کا کوئی مزہ بھی نہ ہو۔ بلکہ کوئی معنی بھی نہ ہوں۔

شعر نمبر (۲) تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟

کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟

مشکل الفاظ:

تجاہل: جہالت برتنا، ناواقفیت کا اظہار کرنا

تجاہل پیشگی: جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش

مدعا: مقصد

سراپا ناز: جو سرتاپا ناز و نزاکت والا ہو یعنی بے حد ناز نخرے والا۔

تشریح:

ہم نے مانا کہ تم حسین ہو اور تمھیں اپنے اوپر بہت ناز ہے لیکن اب یہ بھی تمھاری کیا ادا ہے کہ تم ہر بات پر انجان بننے کی کوشش کرو اور اس سے تمھارا آخر مدعا کیا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

محبوب کا بار آخر ایسی بات تو اسے پوچھنے نہیں دیتا اور اسی بات کی غالب نے زیر نظر شعر میں شکایت بھی کی ہے۔

شعر نمبر (۳) نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں

شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

مشکل الفاظ:

نوازش ہائے بے جا: بے جا نوازشیں، نامناسب عنایتیں

شکایت ہائے رنگیں: خوب صورت شکایتیں

گلہ: شکوہ

تشریح:

میں تو رقیب یا دشمن پر آپ کی بے جا نوازشیں اور مہربانیاں دیکھ رہا ہوں اور آپ اس کی شکایتیں کر کے جس خلوصِ خاطر کا اظہار کرتے ہیں، اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اس کی بھی شکایت بھی نہیں کرتا اور اس بات کا شکوہ بھی کبھی میری زبان پر نہیں آتا۔ دیکھتا ہوں، سہتا ہوں، صبر کرتا ہوں اور اب تو یہی میرا شیوہ رہ گیا ہے۔

شعر نمبر (۴) نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

مشکل الفاظ:

نگاہِ بے محابا: ایسی نگاہ جو بے تکلف اٹھ جائے اور بے حجابی کے ساتھ کسی کو دیکھے۔
تغافل: بے نیازی، لاپرواہی
تمکیں آزما: صبر کی طاقت کو، ضبط کی قوت کو آزمانے والا، آزمائش میں ڈالنے والا

تشریح:

غالب کہتے ہیں کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے دیکھو اور بے باک و بے حجاب ہو کر دیکھو۔ جان بوجھ کر غفلت برتنا کیا، سوائے میری قوتِ ضبط کو امتحان میں ڈالنے کے تمھاری یہ غفلت شعاری جان بوجھ کر تغافل برتنا اور کیا معنی رکھتا ہے۔

شعر نمبر (۵) فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

مشکل الفاظ:

فروغ: روشن ہونا، اور روشنی کا فروغ پانا
خس: گھاس کا تنکا، بہت بے قیمت اور بے قدر شے جس کی کوئی قیمت نہ ہو

یک نفس: ایک سانس کے لیے، ایک لمحہ کے لیے

ہوس: حد سے بڑھی ہوئی خواہش

پاس: لحاظ

ناموسِ وفا: وفاداری کی عزت

تشریح:

یہاں رقیب کا کردار زیرِ بحث ہے کہ اگر اس میں وفاداری کا جذبہ ہے بھی تو برائے نام ہے اور بالکل وقتی ہے۔ جیسے گھاس کے تنکے میں شعلے کا فروغ ہو کر وہ ایک لمحہ میں غائب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رقیب کی وفاداری اور محبت بھی ایک لمحہ کے لیے ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایسے وقتی لوگوں کا اعتبار کیا اور ان کی محبت پر بھروسہ کیوں۔

شعر نمبر (۹) نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے

تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

مشکل الفاظ:

نفس: سانس

موج: لہر

محیط: سمندر (بحرِ بیکراں جس کا کوئی اور چھور نہ ہو)

بے خودی: سرشاری، سرخوشی، عالمِ مدہوشی

تغافل: جان بوجھ کر انجان بننا جو معشوقوں کی ایک ادا ہوتی ہے۔

ساقی: شراب پلانے والا

گلا: شکوہ

تشریح:

میری ہر سانس سرشاری و مدہوشی کے سمندر کی ایک لہر ہے اور جب بے خودی کا یہ عالم ہو تو ساقی کے اس رویے کی کیا شکایت کہ وہ جان بوجھ کر میری طرف سے غفلت برتتا ہے۔ اس میں غالبؔ کے فلسفۂ حیات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دوسروں سے کچھ توقع رکھنے کے بجائے اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ آدمی باہر سے جو کچھ ڈھونڈتا ہے وہ اسے اپنے اندر تلاش کرنا چاہیے۔

شعر نمبر (۷) دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صبا کیا؟

مشکل الفاظ:

دماغ: برداشت

عطرِ پیراہن: لباس کی خوشبو

صبا: صبا صبح کی لطیف ہوا کو کہتے ہیں جو پھولوں کی خوشبو چراتی اور ادھر ادھر اسے بکھیرتی ہے۔

غمِ آوارگی: آوارہ ہونے کا غم

تشریح:

غالبؔ کے اس شعر میں ایک طرح کا طنز شاعرانہ ہے کہ وہ بہ ظاہر کوئی اور بات کہہ رہے ہیں اور حقیقت میں ان کی مراد کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تیرے پیراہن کی خوشبو کو برداشت نہیں کر پاتا اور ان ہواؤں کو اپنے چاروں طرف پا کر پریشان ہوتا ہوں جن میں تیرے پیرہن کی خوشبو ملی ہوئی ہے بلکہ بسی ہوئی ہے۔ یہ صبا کی آوارگی کا غم نہیں ہے۔ یہ خیال ہے اور اس سے پیدا ہونے والی میری نفسیاتی تکلیف ہے کہ تم ادھر ادھر پھرتے ہو، آتے جاتے ہو۔ صبا تمھارے پیراہن کی خوشبو اسی طرح چراتی ہے جیسے پھولوں کی خوشبو چراتی ہے اور وہ جس طرح اس خوشبو کو اپنے جھونکوں کی صورت میں میرے پاس لاتی ہے اسی طرح دوسروں کے پاس لے جاتی ہوگی جو میرے لیے قابلِ رشک

بات ہے۔

شعر نمبر (۸) دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

مشکل الفاظ:

قطرہ: بوند

ساز: نغمہ پیدا کرنے والا کوئی آلۂ موسیقی

انا البحر: میں سمندر ہوں

تشریح:

ہر قطرے کا دل یہ کہتا ہے کہ میں سمندر ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قطرے اور سمندر کی حقیقت ایک ہی ہے۔ جزو اور کل کی تفریق ایک اعتباری بات ہے۔ یعنی ہم ایسا سوچ لیتے ہیں۔ جب حقیقت یہ ہو تو ہم اپنے محبوب یا معشوقِ حقیقی سے الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ دونوں کی یکتائی کو جدائی کی صورت میں دیکھنا صرف ایک ذہنی سوال ہے۔ ورنہ یہ پوچھنے کی بات ہی نہیں ہے۔

شعر نمبر (۹) یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟

یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا؟

مشکل الفاظ:

قاتل: قتل کرنے والا، سخت تکلیف پہنچانے والا

وعدۂ صبر آزما: کسی بھی بات کے لیے یہ کہنا کہ ہم کریں گے اور اس کو پورا نہ کرنا جس سے باعث وہ صبر و ضبط کا امتحان بن جاتا ہے۔

کافر: کفر کرنے والا

فتنۂ طاقت ربا: وہ فتنہ جو کشمکش میں ڈال دے اور برداشت کرنے کی قوت کو ختم کر دے۔ طاقت ربا، طاقت کو زائل کرنے والا، ختم کرنے والا۔

تشریح:

یہ وعدہ آخر کس لیے جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔ جو ہمیں نشتر کی طرح دل کی چبھن میں مبتلا رکھتا ہے اور اس معنی میں ہماری خوشیوں اور امیدوں کا قاتل ہے کہ وعدہ کرنے کا مقصد اسے پورا کرنا نہیں ہے بلکہ ہمیں آزمائش میں ڈالنا ہے۔

غالبؔ نے یہ شعر معاملہ بندی کے سلسلے میں چاہے نہ کہے ہوں لیکن ان پر معاملہ بندی کا گہرا اثر ہے کہ وہ محبوب کے رویے کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر تم وعدہ پورا کرنا نہیں چاہتے تو ہمیں صبر و ضبط کی مشکلات میں کیوں ڈالتے ہو، کوئی توقع اپنے رویے سے کیوں پیدا کرتے ہو اور زندگی میں ایسے فتنے کیوں جگاتے ہو جو دل و دماغ کو بے طرح پریشان کر دیں۔ اور ان سے عہدہ برآں ہونے کی کوئی صورت بھی سامنے نہ ہو۔

شعر نمبر(۱۰) بلائے جاں ہے اس کی ہر بات

عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

مشکل الفاظ:

بلائے جاں:	مراد معشوق	عبارت: تحریر
اشارت:	اشارہ و کنایہ	ادا: انداز، ناز

تشریح:

اے غالبؔ اس کی تو ہر بات قیامت ہے۔ چاہے اس کی ادائیں ہوں، چاہے اس کا غمزہ و ناز ہوں یا اس کی تحریر ہو۔ یہاں تحریر غالباً اس لیے لکھا گیا کہ اس نے کوئی خط لکھا ہو گیا اور اس میں شوخیوں کا اظہار کیا ہوگا۔

غالبؔ کے تصورِ عشق کا ایک پہلو ان کا تصورِ حسن بھی ہے اور اسی تصور کے آئینے میں ہم ان کے معشوق یا معشوقہ کو بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ان کو کس طرح کی شخصیتیں پسند ہیں۔

غزل نمبر:۱۵

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونِ ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

شعر نمبر(۱) درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

درخور: لائق   قہر و غضب: غصہ اور غضب کی

قہر: صفت جلال کو کہتے ہیں۔ جس کے ساتھ ظلم و ستم کا تصور بھی وابستہ ہے۔

تشریح:

جب کوئی ہماری طرح تمھارے قہر و غضب کا سزاوار اور مستحق نہ ٹھہرا اور آپ کے ظلم و ستم کا نشانہ ہم ہی رہے تو پھر ہماری طرف سے یہ دعویٰ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا۔

غالبؔ نے اس غزل میں بعض ایسے فقرے بھی لکھے ہیں جو عام لوگوں کی زبان پر آتے رہتے ہیں۔ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا یہ بھی انھیں فقروں میں سے ایک ہے۔ اس طرح کی دعویداریاں کسی بڑے فن کار کی طرف سے اچھی نہیں لگتیں۔

شعر نمبر (۲) بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

بندگی:	عاجزی، انکساری، غلام ہو جانا
آزادہ:	آزاد مزاج
خودبیں:	خود پسند، خود کو دیکھنے والا
وا نہ ہوا:	نہ کھلا

تشریح:

اگرچہ ہم نے بندگی اختیار کی، عاجزی اور انکساری کو اپنا شیوہ بنایا پھر بھی اتنے آزاد مزاج اور خود پسند رہے کہ ہمارے استقبال کے لیے اگر کعبہ کا دروازہ نہ کھلا تو ہم واپس آ گئے۔

یہ غالبؔ کی جاگیردارانہ فطرت ہے جس کا مظاہرہ اس شعر میں ہوا ہے اور طبقاتی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔

شعر نمبر (۳) کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں

تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

نازش: ناز، فخر

ہم نامی: ایک جیسا نام ہونا

چشمِ خوباں: حسینوں کی آنکھیں

تشریح:

یہاں بیمار کا لفظ کلیدی لفظ ہے۔ بیمار عاشق بھی ہے اور محبوب کی خوب صورت آنکھ بھی کہ اردو شاعری میں ان آنکھوں کو جو کسی طرف دیکھتی نہیں ہیں اور نیچے جھکی رہتی ہیں، ان کو چشمِ بیمار کہا جاتا ہے۔ عاشق خود بھی عاشقِ بیمار کہلاتا ہے۔ اس معنی میں محبوب کی آنکھیں اور عاشقِ زار بیمار کا نام ایک ہی ہو جاتا ہے۔ وہاں چشمِ بیمار اور یہاں عاشقِ بیمار۔ محبوب کے ساتھ ہم نامی کا فخر بھی کچھ کم نہیں۔

شعر نمبر (۳) سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

سینے کا داغ: کالا دھبہ جو آگ کے جلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مراد غم کا نشان

نالہ: فریاد

خاک کا رزق: مٹی میں مل جانا

تشریح:

غالبؔ نے اس کا اظہار کیا ہے کہ نالے اور فریاد کو لبوں پر آنا چاہیے نہیں تو وہ سینے کا داغ بن جائے گا۔ اور جو قطرۂ اشک آنکھ سے نکل کر دریا کا روپ اختیار نہیں کرتا اور اس سے طوفان برپا نہیں ہوتا، وہ تو مٹی کا رزق بن جاتا ہے۔ اس کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ بقول اقبالؔ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

احساس وجود اگر اپنی نمود کو ظاہر نہیں کرتا اور اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو سامنے نہیں لاتا تو اس کے کوئی معنی بھی نہیں ہیں۔ حقیقت اپنی جگہ ہے اور اس کی نمود اور سہود کے مرحلے الگ ہیں اور وہی اس کی شناخت ہیں۔

شعر نمبر (۵) ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونِ ناب

حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

بنِ مو: بال کی جڑ، رونگٹے، ہماری جلد میں موجود مسامات

خونِ ناب: خالص خون

حمزہ کا قصہ: داستان امیر حمزہ

چرچا: شہرت

تشریح:

قصۂ عشق کچھ اور ہے یعنی ہماری داستانیں وغیرہ وہ دل جب اس کا بیان ہوتا ہے یا ہو تو سننے والے کے اور ذکر کرنے والے کی آنکھوں سے ہی نہیں ہر بنِ مو سے خون ٹپکنے لگے تو وہ داستان غمِ عشق ہے۔ اگر یہ سب نہیں ہوتا تو وہ صرف کہانی ہے۔ امیر حمزہ کا قصہ ہے۔

عشق کی تڑپ، اس کی بے قراریاں اور جذبۂ محبت کی تڑپ تو ایک قیامت ہے کہ اس کا صرف ذکر ہی سننے والے کو بے قرار کر دیتا ہے اور سنانے والے کے دل و دماغ پر ایسا قیامت خیز اثر ہوتا ہے کہ وہ خون کے آنسو روتا ہے بلکہ خون اس کے رونگٹے سے ٹپکتا ہے۔

شعر نمبر (۶) قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

مشکل الفاظ:

دجلہ: عراق کا ایک بڑا دریا

جزو: ایک چھوٹے سے چھوٹا حصہ

کل: مکمل اکائی

دیدۂ بینا: گہرائی سے دیکھنے والی آنکھ

تشریح:

آنکھ تو وہ ہے جو گہرائیوں کے ساتھ دیکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ بچوں کا کھیل رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایک قطرے میں سمندر اور ایک ذرہ میں صحرا اگر کوئی نہیں دیکھ سکتا تو وہ دیدۂ بینا سے ہی محروم ہے۔

غزل نمبر:۱۴

بہ نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے

ملا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہاں ہر بُت پیغارہ جو ، زنجیر رسوائی

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

شعر نمبر (۱) پے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا

بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

مشکل الفاظ:

پے: واسطے، برائے

نذر: پیش کرنا۔ اپنے سے بڑے مرتبے والے کو یا بزرگ کو، وہ کوئی بھی شے ہو سکتی ہے جو پیش کی جائے۔

شرمِ نارسائی: نہ پہنچ سکنے کی شرم، ندامت

تحفہ: کوئی بھی شے جو دوستانہ طور پر کسی کو پیش کی جائے

بخوں: خون میں

ظلطیدن: لتھڑنا، آلودہ ہونا

صد رنگ: ہزار رنگ یعنی رنگا رنگی، طرح طرح سے

پارسائی: پاکیزہ زندگی

دعویٰ: کسی بات کی طرف خصوصی توجہ اور اشارے کے طور پر کہا گیا

تشریح:

آپ مجھ پر مہربانی فرمانا چاہتے تھے اور اپنے کرم سے کوئی شے بطور نذر مجھے عطا کرنا چاہتے تھے۔ اب

میں اس کے بدلے میں کیا کر سکتا ہوں اور کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں تو اس لائق بھی نہیں ہوں کہ آپ کے لطف و کرم سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ نارسائی کا یہ عذر ہی گویا میری طرف سے آپ کے غائبانہ نظرِ کرم کی خواہش کے جواب میں یہ ایک ادنیٰ سا تحفہ ہے جو میں پیش کر سکتا ہوں۔

میں اپنے خونِ دل میں ہزار طرح سے آلودہ رہتا ہوں۔ نہ جانے کتنے دھبے ہیں جو میرے دامن کو لالے کی طرح داغ دار بنائے ہوئے ہیں اور اس پر بھی میرا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ میں بے قصور ہوں اور میری زندگی میں گناہوں سے آلودہ ہونے کی کوئی روش نہیں ہے۔ مجھ پر کوئی الزام بھی عائد نہیں کیا جا سکتا۔

دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ کہنا چاہتے تھا کہ آپ تو مائل بہ کرم تھے ہمیں اس لائق نہ ہوئے کہ آپ کی نوازشوں سے سرفراز ہو سکیں۔ اس پر اظہارِ ندامت کے علاوہ اور ہم اپنی طرف سے کیا کر سکتے ہیں یا کیا کہہ سکتے ہیں۔

دوسرا مصرعہ کسی ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو واقعے کے طور پر غالبؔ کے ذہن میں ہے لیکن یہاں اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ بس یہ پتہ چلتا ہے کہ بہت سی مجبوریاں تھیں جن کے اعتراف کے ساتھ اپنی نیک نیتی کا اظہار کر سکے۔

شعر نمبر (۴) نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا

بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مشکل الفاظ:

حسن تماشا دوست: حسن سے مراد معشوق جو تماشے کو دوست رکھتا ہے یعنی تماشا پسند کرتا ہے

رسوا کرنا: بدنامی (غالبؔ نے بدنامی کا لفظ غلط استعمال کر دیا) یا جیسے معنی میں نہیں آتا۔

بہ مہرِ صد نظر: سینکڑوں نگاہوں کی مہر کے ساتھ

تشریح:

ایسا کوئی شخص جو ہر ایک کے سامنے آتا ہو اور خاص طور پر عورت جو بے پردہ اپنا مکھڑا دکھلاتی ہو، وہ معاشرے میں پسندیدہ کردار نہیں ہوتے۔ غالبؔ نے پہلے شعر کی طرح جس میں دامن کو ہزار دھبوں کے ساتھ پاکیزہ کرداری کی بات کی تھی، یہاں بھی یہ کہا ہے کہ میرا محبوب جو تماشا دوست ہے وہ اس تماشا بینی کے باوجود بے حد پارسا ہے اور جو نگاہیں اس کے چہرے پر پڑتی ہیں وہ اس کی پارسائی پر اپنی طرف سے گویا مہر لگاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے دو مطلعے کہے تھے اور ان میں سے ایک کو رکھنا چاہتے تھے لیکن بعد میں کسی وجہ سے دونوں باقی رہ گئے۔ اسی لیے ایک ہی قافیے اور ایک ہی مفہوم کے ساتھ یہ دونوں مطلعے موجود ہیں۔

شعر نمبر (۳) زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا

چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

مشکل الفاظ:

زکاتِ حسن:	حسن کی زکات
بینش:	بینائی، آنکھوں کی روشنی
مہر آسا:	سورج کی طرح
چراغِ خانہ:	گھر کا چراغ
درویش:	فقیر
کاسۂ گدائی:	بھیک کا پیالہ

تشریح:

اے میرے محبوب تو اپنے حسن اور خوبیوں کے اعتبار سے بہت دولت مند ہے اور اس معنی میں تجھ پر زکاۃ واجب ہے اور حسن کی زکات یہ ہے کہ تو مجھے اپنا جلوہ دکھلاتا رہے تاکہ میری آنکھیں جو کاسہ گدائی کی طرح ہیں اور تیرا جلوہ دیکھنے کے لیے ہمیشہ بے قرار رہتی ہیں، وہ چراغ کی طرح روشن ہو جائیں اور وہ صورت ہو جیسے چاند یا سورج چمکتے ہیں تو غریب کے گھر میں روشنی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے غریب خانے میں کوئی چراغ نہیں ہوتا۔ پہلے زمانے میں غربت اتنی ہی ہوتی تھی کہ گھڑے پر پیالہ اور چراغ میں تیل نہ ہو یعنی گھر بے طرح مفلس ہو۔ ہر بات ہر چیز سے محروم۔

شعر نمبر (۴) ہمارا جان کرے ہے جرم قاتل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

مشکل الفاظ:

مانند خون بے گناہ: بے گناہ کے خون کرنے کی طرح

حق آشنائی: آشنائی کا حق ادا کرنا

آشنائی: دوستی

تشریح:

اے میرے محبوب تو مجھ پر مہربان ہے اور اس معنی میں تیری طرف سے میرا قتل کر دینا بھی بڑا احسان ہوتا۔ مگر تو نے ایسا نہیں کیا اور آشنائی کا حق ادا نہیں کیا اور یہ حق تیری گردن پر اس طرح رہا جیسے کسی بے گناہ کو قتل کر دینے کا الزام ہوتا ہے۔

شعر نمبر (۵) تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے

مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

مشکل الفاظ:

تمنائے زباں: کاش مجھے زبان ملتی، میں بھی اپنی بات کہہ سکتا۔

محو سپاس: تعریف میں محو ہونا۔ یعنی اس طرح تعریف کرنا کہ خود کو آدمی بھول جائے۔

تقاضا:　　کسی بات کے لیے زور دے کر کہنا کہ یہ کیا جائے۔

بے دست وپائی:　　بغیر ہاتھ پیر کے یعنی مجبور محض ہونا۔

تشریح:

میں اگر یہ تمنا کرتا ہوں کہ مجھے بھی زبان میسر آئے تو اس میں شکریے کا یہ جذبہ بھی چھپا ہوا ہے کہ یہ اچھا ہے کہ میں بے زبان ہوں۔ اگر زبان ہوتی تو بے دست وپائی کا شکوہ کرتا۔ اب زبان نہیں ہے تو کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔

ایسے شعر غالبؔ نے بہت سے لکھے ہیں۔ جن میں جس حالت پر شکوہ کیا جانا چاہیے اس پر بھی شکریہ ادا کیا جا رہا ہے کہ اس طرح ایک خواہش اور ایک تمنا سے جو سبب تکلیف تھی، نجات مل گئی۔

شعر نمبر (۶) وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

مشکل الفاظ:

نفس:　　سانس

نکہت گل:　　پھولوں کی خوشبو

چمن کا جلوہ:　　چمن کی خوب صورتیاں

رنگیں نوائی:　　خوب صورت آواز، اچھی شاعری، حسین خیالات

تشریح:

وہی ایک بات ہے جو میرے یہاں شعر وسخن ہے اور چمن کے جلوے میں حسن اور رعنائی ہے۔ میری شاعری چمن کے جلوؤں کو خوب صورت بناتی ہے اور چمن کے جلوے نے میری شاعری کو حسن و رعنائی عطا کی ہے۔

شعر نمبر (۷) دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

مشکل الفاظ:

دہاں: منہ

پیکار: جھگڑا، قضیہ

عدم: ملک عدم، وہ دنیا جہاں ہر شے ختم ہو جاتی ہے۔

تشریح:

محبوب شکوہ سنج ہو سکتا ہے، لڑائی کی باتیں کر سکتا ہے مگر حسین و ناز میں شخصیتوں کے لب و زبان ہوتے کہاں ہیں۔ وہ تو عدم کا وجود رکھتے ہیں اس لیے کہ محبوب کے دہانے کو چھوٹا ہونے کی صفت کے باعث نقطۂ موہوم کہتے ہیں

یہاں عدم تک شکوے کی زنجیر کا پہنچنا ایک طرح کا اشاراتی عمل ہے کہ بات محبوب کے دہانے تک پہنچ گئی ہے جو ہے ہی نہیں اور اس معنی میں موجود ہے کہ عدم ہونے کے باوجود وجود اور ہستی سے محروم نہیں ہے۔

غزل نمبر: ۱۷

گرنہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ سے مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

فائدہ کیا؟ سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ

دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

شعر نمبر (۱) گر کہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

اندوہ: غم، اداسی   شبِ فرقت: جدائی کی رات

داغِ مہ: چاند کا داغ   مہرِ دہاں: لبوں کی مہر

دہاں: منہ

تشریح:

اگر میں زمانۂ جدائی کے ان غموں اور دکھوں سے بھرے ذہنی واردوں کو اپنے دل پر گزرتے ہوئے حالات کو بیان نہیں کرسکوں گا اور یہ دکھ میرے دل ہی میں رہ جائے گا تو اس کا انجام یہی ہوگا کہ میرے منہ پر بھی اسی طرح مہر لگ جائے گی جیسے چاند کے لبوں پر لگ گئی ہے اور اس کے کالے دھبے گویا اس کے لبوں پر لگی ہوئی مہر ہے۔ اگر میں اندوہ وشبِ فرقت کو بیان کر پاؤں گا تو جس طرح چاند کے دل میں ہزار داغ پڑے ہوئے ہیں میرے لبوں پر بھی داغوں کی مہر لگ جائے گی۔

شعر نمبر (۲) زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب

پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

زہرہ: پتہ		زہراب: زہر ملا پانی

شامِ ہجر: جدائی کی شام		پرتوِ مہتاب: چاند کا پرتو یعنی چاندنی

سیلِ خانماں: گھر کا سیلاب

تشریح:

اگر غمِ جدائی اسی طرح میرے ذہن اور زندگی پر مسلط رہا تو بغیر تکلف کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ میری ذہنی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ گھر کے صحن میں بھری ہوئی چاندنی کو میں یہ محسوس کروں گا جیسے میرے گھر میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ یعنی جدائی کی رات کے صدموں سے میرے ہوش حواس اس طرح معطل ہو جائیں گے کہ اچھی چیزوں سے بھی میں لطف نہ لے سکوں گا۔

شعر نمبر (۳) دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا

یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

صرفِ وفا: وفاداریوں میں کام آنے والا

نذرِ امتحاں: امتحاں کی بھینٹ چڑھ جانا

تشریح:

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تو پہلے ہی مرحلے میں کام آ جائے گا یعنی عشق کے پہلے مرحلے ہی میں دل ہاتھوں سے نکل جائے گا اور امتحانِ وفا کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ گر اس نے تو ذرا بھی ساتھ نہ دیا۔

شعر نمبر (۴) گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

نگاہِ گرم: سخت نگاہ، غصے کی نظر

تعلیمِ ضبط: صبر و ضبط کی تعلیم

خس: تنکا جو آگ پکڑ لیتا ہے۔

شعلہ: آگ

نہاں: چھپا ہوا، نظروں سے غائب

تشریح:

اگر اس کی غصے میں بھری ہوئی نظر اسی طرح صبر و ضبط کا تقاضا کرتی رہی تو جس طرح رگوں میں خون ہوتا ہے، میرے منہ میں دبا ہوا تنکا شعلہ خس کی شکل اختیار کرے گا۔ میں اظہارِ عاجزی کروں گا مگر میرے گرم سانسوں کی وجہ سے منہ میں دبا ہوا تنکا جل اٹھے گا اور میری عاجزی بھی ایک طرح کا اظہارِ بغاوت بن جائے گی۔

شعر نمبر (۵) باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

گلِ تر: تر و تازہ پھول

خوں فشاں: آنکھوں سے لہو برسانے والا

تشریح:

اس حالت میں کہ میرا دل زخم زخم ہے۔ اگر مجھے تم سیرِ باغ کے لیے لے جاؤ گے تو جو وہاں پھول ہوں گے وہ بھی میرے حالات کی خرابیوں کو دیکھ کر بری طرح افسردہ ہو جائیں اور ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے گا جو شدتِ غم کا اظہار کرے گا۔

شعر نمبر (۹) فائدہ کیا؟ سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

مشکل الفاظ:

دانا: عقل مند

زیاں ہونا: نقصان ہونا

تشریح:

اے اسدؔ سمجھداری سے کام لے، اتنا نادان نہ بن۔ بیوقوفوں سے دوستی کر کے اپنے جی کا زیاں کیوں کرتا ہے۔ اردو میں اس طرح کا ایک محاورہ بھی ہے۔ بے وقوف کی دوستی، جی کا جنجال۔

غزل نمبر: ۱۸

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ مت دو
مجھے دماغ نہیں خنداں ہائے بیجا کا

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُن مو کام چشم بینا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

شعر نمبر(۱) گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مشکل الفاظ:

شوق:	محبت، عشق	تنگی جا:	جگہ کی تنگی
گہر:	موتی	محو:	گم
اضطراب:	بے چینی، بے قراری	دریا:	سمندر

تشریح:

میرا شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ میرے دل کی وسعتوں میں بھی نہیں سماتا جب کہ سمندر کا اضطراب ایک موتی میں سمٹ جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ دریا کی تمام تر بے قراریاں ایک موتی سی شکل میں سمٹ جاتی ہیں۔ دوسری طرف میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے شوق کی وسعتیں، اس کا پھیلاؤ دل میں بھی نہیں سماتا اور تنگی ظرف کی شکایت کرتا ہے۔

غالبؔ نے اپنی تمناؤں، خواہشوں اور خوشیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ جیسے وہ واقعی بڑی ہیں اور اس پھیلاؤ کے ساتھ ہیں کہ ان کی کہیں سمائی نہیں اور دل جیسی بڑی وسعتوں والی جگہ میں بھی اس کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

شعر نمبر(۲) یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

مشکل الفاظ:

پاسخ:	جواب
مکتوب:	تحریر، خط
ستم زدہ:	ستم کا ظلم کا مارا ہوا
ذوق:	شوق
خامہ فرسا:	تحریر کرنے والا، قلم سے لکھنے والا

تشریح:

میں جانتا ہوں کہ تو میرے خط کا جواب نہیں دے گا پھر بھی خط لکھتا ہوں، لکھتا رہتا ہوں کہ مجھے تو خط لکھنے کا شوق ہے اور میں اس شوق کا مارا ہوا ہوں، ستم زدہ ہوں۔

شعر نمبر(۳) حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

مشکل الفاظ:

حنا:	مہندی

خزاں: پت جھڑ کا موسم

کلفتِ خاطر: طبیعت کا ملال

دوام: ہمیشگی، باقاعدگی، تسلسل

تشریح:

اگر بہار کہیں ہے بھی تو اس کی حیثیت خزاں کے پیروں میں لگی ہوئی مہندی جیسی ہے۔ مہندی اگر لگی ہے تو پیر سمیٹے پڑے ہیں۔ وہ کچھ وقت کے لیے کام نہیں کرتے۔ اسی طرح اگر بہار آتی بھی ہے تو وہ خزاں کے پیروں کی مہندی ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دنیا کا عیش یہاں کے غموں کو بڑھاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر بہار آتی بھی ہے تو وہ خزاں کے پیروں کی مہندی کی طرح ہے۔ وہ کچھ وقت کے لیے آتی ہے اور یہی وقت خزاں کے احساس کو بڑھا دیتا ہے۔

شعر نمبر (۲) غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ مت دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مشکل الفاظ:

غمِ فراق: جدائی کا غم

خندہ ہائے بیجا: طنزیہ ہنسی، مذاق اڑانے والی مسکراہٹ

تشریح:

کہتا ہے کہ میں جدائی کے غموں کا شکار ہوں۔ ایسے وقت میں مجھے سیرِ باغ کی تکلیف نہ دو۔ تم مجھے پھولوں کی سیر کراؤ گے اور میں یہ سمجھوں گا کہ یہ مسکراتے ہوئے پھول میرے غموں کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس کو برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اردو کا ایک شعر ہے ۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر

کہ تاروں کی چمک سے چوٹ پڑتی ہے رگِ جاں پر

شعر نمبر(۵) ہنوز محرمئ حسن کو ترستا ہوں

کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

مشکل الفاظ:

ہنوز:	ابھی تک،اب تک
مُو:	بال
محرمئ حسن:	حسن کے بھیدوں کو سمجھ سکنا اور اس کے راز سے واقف ہونا
بُن:	اُگنے کی جگہ، جڑ
چشمِ بینا:	دیکھنے والی آنکھیں

تشریح:

راز حیات سے ہر شخص واقف نہیں ہو سکتا اور حسن کے بھیدوں سے واقف ہونا اور محرم راز ہونے کی منزل تک پہنچ سکنا ہر ایک کا مقدر نہیں ہے۔ وہ ہزار کوشش کرے اور چشمِ بینا کرے۔ یہاں غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی ایک بھیدوں بھری سچائی ہے، ایک پُر اسرار حقیقت ہے۔ اس سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ محرمئ حسن شاید عقل و ہوش کا مقدر ہی نہیں ہے اور اس کے باوجود نہیں ہے کہ انسان کو چشمِ بینا مل جائے۔ اس کی قسمت کا حصہ بن جائے۔ فارسی کا ایک مشہور شعر ہے ۔

ہر کس نا شناسندۂ راز است وگرنہ

ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

(یہاں ہر آدمی راز کو جان ہی نہیں سکتا اور جو لوگ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ در اصل ناواقف ہیں اور نہیں تو وہ تمام باتیں جن کو وہ جانتے ہیں وہ تو خود ہی راز ہیں اور ابھی تک راز ہیں۔)

شعر نمبر(۶) دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مشکل الفاظ:

ناز و ادا: حسن کی ادائیں جن کو عشوہ و غمزہ کہا جاتا ہے۔

دماغ: برداشت

تشریح:

ہم نے اس کے حسن کی سادگی اور بے ادائی پر اپنا دل قربان کر دیا کہ ہمارا ذہن اس بات کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ بار بار تقاضا کرے اور دل دینے کا تقاضا کرے۔ تب ہم اسے اپنا نذرانہ دل پیش کریں۔ یہ لفظ تقاضا ایک معاشرتی معنی رکھتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی قرض یا حق دوسرے پر ہوتا ہے تو وہ بار بار اسے جتاتا ہے اور قرض چکانے کی بات کرتا ہے۔

غالب ساری عمر مقروض رہے اور قرض خواہوں کی طرف سے کوئی دعویٰ کیا جائے یہ غالب کو پسند نہیں تھا۔ اسی کشمکش میں انھوں نے ساری زندگی گزار دی۔

شعر نمبر (۷) نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

مشکل الفاظ:

گریہ: رونا، آنسو بہانا

حسرت دل: دلی حسرتیں، نامرادیاں، ناکامیاں

جمع و خرچ: کیا آتا ہے اور کیا خرچ ہوتا ہے۔

تشریح:

اے میرے دوست یہ خیال نہ کرو کہ میرے رونے سے مجھے تسکین میسر آجائے گی۔ آخر میں کب تک روؤں گا اور کتنا روؤں گا۔ کہیں بادل سمندر سے اٹھ کر جائیں یا سمندر پہ بارش ہو۔ سمندر اس کا حساب و کتاب رکھتا ہے۔ مگر آمد و خرچ کے معنی جانتا ہے۔

شعر نمبر (۸) فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ

جفائیں اس کی ہے انداز کارفرما کا

مشکل الفاظ:

فلک: آسمان

جفا: ظلم و ستم

انداز کارفرما: جو خود بھی ستم کرتا ہے اور دوسروں کو بھی ستم کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے طریقے سکھاتا ہے۔

تشریح:

اے اسدؔ میں اس کو دیکھتا ہوں تو مجھے ظلم کرنے والا آسمان یاد آ جاتا ہے اور آسمان کے ظلم و ستم نظر کے سامنے ہوتے ہیں تو وہ یاد آتا ہے۔ یعنی میرا معشوق اس لیے کہ اصل میں تو ظلم و ستم میرے معشوق کی عادت ہے۔ آسمان نے بھی اسی سے ظلم و ستم سیکھا ہے اور آسمان کے ظلم اپنے انداز سے مجھے یہ بتلاتے ہیں کہ ان تمام ظلم و ستم کی اداؤں کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ان کا ذمہ دار کون ہے۔

غزل نمبر ۱۹

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

تازہ نہیں ہے نشہ فکر سخن مجھے
تریاکی قدیم ہوں دود چراغ کا

بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل

ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

شعر نمبر (۱) یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا

یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

مشکل الفاظ:

یک ذرۂ زمیں: باقی زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا حصہ

جادہ: پتلا، چھوٹا راستہ، تنگ راہ

فتیلہ: بتی

تشریح:

غالب نے کہا ہے کہ دنیا میں، جو ایک باغ کی طرح ہے کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور کم تر سے کم تر درجے کی چیز بھی بے کار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تنگ سے تنگ راستہ جس کو ہم جادہ کہتے ہیں اور جو باغ کی روش کے طور پر ایک نیا معنی اختیار کر لیتا ہے وہ بھی چراغ راہ یا لالے کے داغ کے لیے ایک فتیلہ بن جاتا ہے جو آخر لالے کے چراغ کو روشن کرتا ہے اور لالے کا چراغ روشن جب جلتے جلتے بجھ جاتا ہے تو اپنی جگہ داغ چھوڑ جاتا ہے جو چاند کے داغوں کی طرح روشنی کا سبب ہوتا ہے۔

شعر نمبر (۲) بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی

کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

مشکل الفاظ:

طاقت: تاب و تواں
آشوبِ آگہی: علم و ادراک کا جادو اور اس کا اٹھایا ہوا فتنہ
عجزِ حوصلہ: حوصلے کا عجز یعنی حوصلے کی کمی
خطِ ایاغ: شراب کے جام پر بنا ہوا خط

تشریح:

آدمی عقل کا ظلم و ستم و اس کے اٹھائے ہوئے قصّے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ شراب کا نشہ ہے جو اس میں اس قصّے کو برداشت کرنے کی تاب و تواں پیدا کرتا ہے۔ اگر جامِ شراب کے گرد خطِ ایاغ نہ ہو تو ہم تو بے تحاشہ شراب پی سکتے ہیں۔ یہ خط ہمیں روکتا ہے جو ہمیں زیادہ شراب پینے کی اجازت نہیں دیتا۔ غالب کا ایک اور شعر ہے جو اس مضمون کی وضاحت کرتا ہے۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

شعر نمبر(۳) تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

مشکل الفاظ:

فکرِ سخن: شعر کہنے کے موڈ میں ہونا اور ایک طرح کا دل و دماغ پر نشے کا سا عالم ہونا

تریاکی: افیم کھانے والا

تریاک: افیم

دودِ چراغ: چراغ کا دھواں

تشریح:

شراب پینے کے بعد آدمی عام طور پر نشے کے عالم میں ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ شراب کے نشے کے عادی ہو جاتے ہیں، وہ پھر افیم کا نشہ کر لیتے ہیں۔ لکھنؤ میں اس کا رواج بہت رہا ہے کہ وہ لوگ افیم کھاتے تھے۔ غالبؔ غالباً افیم تو کبھی نہیں کھاتے تھے لیکن شراب کے نشے کے بے حد عادی تھے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ میں تو ایک زمانے سے فکرِ سخن کا عادی ہوں اور شعر و شاعری میرے لیے وہ معنی رکھتی ہے جیسے کچھ لوگ افیم کی چسکی لیتے اور اس کے نشے میں جھومنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

میں راتوں کو جاگ کر شاعری کرتا رہا اور چراغ کا دھواں میرے لیے افیم کا نشہ بنا رہا۔ اس میں غالبؔ شعر و سخن سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور راتوں کو جاگنے کا ذکر کرتے ہیں اور چراغ کے دھوئیں کو اپنے لیے افیم کی چسکی کہتے ہیں۔

شعر نمبر (۲) بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار

یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

مشکل الفاظ:

خونِ دل: رگوں میں دوڑنے پھرنے والا لہو جس کا سرچشمہ دل ہوتا ہے۔

موجِ نگہ: دیکھنا، وہ شعاع جو آنکھوں سے تعلق ہے اور جس کی مدد سے آدمی دیکھتا ہے۔

غبار: دھول کی طرح

مے کدہ: شراب خانہ

تشریح:

بغیر خونِ دل کے دیکھنے والی شعائیں بھی یہ کہتے کہ موجِ غبار کا وجود رکھتی ہیں۔ اب شراب نہیں ملتی، کہیں اس کا اتہ پتہ نہیں تو مے کدے میں بھی خاک اڑ رہی ہے۔

شعر نمبر (۵) باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

مشکل الفاظ:

باغِ شگفتہ: کھلا ہوا تر و تازہ باغ

بساط: مسندِ محفل

نشاطِ دل: دل کی خوشیاں اور مسرتیں

ابرِ بہار: بہار کا بادل

خم کدہ: شراب خانہ، مے خانہ

تشریح:

اے میرے محبوب تیری خوب صورت شخصیت اور تیرا دل کش وجود اگر ایک شگفتہ چمن اور باغِ تازہ کا وجود رکھتا ہے اور تجھ سے محبت کرنے والے کے لیے وجہ مسرت اور سبب شادمانی ہے تو ابرِ بہار اگر مے خانہ نظر آتا ہے، یہ کس کے دماغ کا پرتو ہے۔ کس کے خواب و خیال کی جلوہ گری ہے۔ یعنی اگر تو چمنستان پر بہار کی طرح ہے تو ابرِ بہار کا حسن اور سحر دل کشی کسی کے فکر کا پرتو۔ کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر تیرا حسن دنیا کی رونق ہے تو میرا دماغ بھی دنیا کے لیے فکر انگیز ہے۔

غزل نمبر:۳۰

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

شعر نمبر(۱) غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

مشکل الفاظ:

غافل: غفلت برتنے والا ، نادان

بہ وہم ناز: اپنے ناز و ادا کے وہم میں پڑ جانے کی وجہ سے

خود آرا: خود کو سنوارنا

شانہ: کنگھا

شانۂ صبا: صبح کی ٹھنڈی ہوا جو کنگھے کی طرح گھاس کے ایک ایک تنکے کو سجاتی ہے۔

طرہ: زلفوں کی لٹ

گیاہ: گھاس کا تنکا

تشریح:

غالبؔ نے یہ خیال انگیز شعر یہ سوچ کر لکھا ہے کہ قدرت تو ازل کی طرح خود بخود ایک ایک شے کی حفا

بندی کرتی ہے اسے سجاتی ہے اور اگر آدمی آرائش کے خیال سے اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی یا بھرم ہے کہ ہر شے کا اپنا ایک حسن جو قدرت کا عطیہ ہے۔ انسان اس پر کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ایسا سوچنا اس کی بھول ہے۔

شعر نمبر (۲) بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ

صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

مشکل الفاظ:

قدح:	شراب کا جام	بزم:	محفل
تمنا:	خواہش	تمنائے عیش:	عیش کی تمنا
صید:	شکار	ز دام:	جال سے
جستہ:	اُکھڑا ہوا، بھاگا ہوا		
دام گاہ:	جہاں جال بچھایا گیا ہو		

تشریح:

غالب نے ایک عجیب و غریب شعر کہہ کر اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس محفل دنیا سے جو شراب خانے کی طرح ہے عیش کی تمنا نہ رکھو کہ یہاں عیش ایک ایسے رنگ کا وجود رکھتا ہے جو محفل سے اڑ گیا ہو۔ یعنی یہاں اگر کوئی رنگ آتا بھی ہے تو کتنی دیر کے لیے آتا ہے۔ وہ تو کچھ پھولوں کی طرح، خوشبوؤں کی طرح پلک جھپکنے میں اڑ جاتا ہے اور خوشیوں کے لمحے تمام ہو جاتے ہیں اور آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی یہ تمام رونقیں، رنگینیاں اور رعنائیاں وقتی ہیں، ذرا سی دیر کے لیے ہیں۔ جن کو دائم نہ سمجھو اور جن سے دل نہ لگاؤ۔

شعر نمبر (۳) محفل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے

پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

مشکل الفاظ:

مقتل: قتل کی جگہ

نشاط: مسرت، شادمانی

پُر گل: پھولوں سے بھرا ہوا

نگاہ کا دامن: نظر

تشریح:

میں مقتل کی طرف کس شادمانی اور احساسِ مسرت کے ساتھ جاتا ہوں اور میرا دامن خیال تصورِ زخم سے اس طرح بھرا ہے جیسے میں نے اپنے دامن میں پھول چن رکھے ہیں۔ یہاں غالبؔ نے مقتل کو جاتے وقت خیالِ زخم سے خوش ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن زخم لگایا جانا ایک بات ہے اور مقتل میں قتل کیا جانا ایک دوسری بات ہے۔ (اس پر حیرت ہوتی ہے کہ غالبؔ نے دونوں کو کیسے ملا دیا۔)

شعر نمبر (۳) جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ

پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

مشکل الفاظ:

جاں: جان

درہوائے: خواہش میں اُلجھا ہوا ہے۔

یک نگاہِ گرم: ایک ہی نگاہ جو قہر آلود اور غضب ناک ہو

پروانہ: چراغ کے گرد چکر لگانے والا پتنگا

وکیل: وکالت کرنے والا

دادخواہ: انصاف کا طلب گار، داد کا طالب

تشریح:

اے اسدؔ میری روح اس خواہش میں والہانہ پن کے ساتھ رقص کر رہی ہے کہ اس کی ایک قہرناک نگاہ ہو یا غضب ناک چتون ہو اور جو مجھے ایک لمحے میں اس طرح جلا دے جیسے پروانہ شمع پر جل جاتا ہے اور اپنی جان نذر آتش کر دیتا ہے۔ یہاں
پروانے کے وکیل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میری خواہش یا موت کی تمنا کے کیا معنی ہیں یہ تو پروانہ ہی بتا سکتا ہے۔
پروانہ شمع پر جان دیتا ہے مگر شمع اس کے لیے نگاہ کرم کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ شمع کو پروانوں کے لیے غضب ناک اور قہر آلود نگاہ والا کہا بھی نہیں جاتا۔ اوپر کے شعر کی طرح یہاں بھی غالبؔ نے جدت تلاش کی ہے، وہ بے تکی ہے۔ پروانے کو وکیل کہنا بھی اس خیال کی وضاحت کے لیے کچھ زیادہ مناسب بات قرار نہیں دی جا سکتی۔

ردیف ۔ ی

غزل نمبر:۱

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

شعر نمبر(۱)صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

مشکل الفاظ:

مژگاں: پلکیں

صد جلوہ: صدہا منظر، بہت سے مرقعے

روبرو: سامنے

دید: دیدار، دیکھنے کی خواہش

احسان: کسی کے لطف و کرم کا احساس ہونا اور اس کے ایک معنی میں زیرِ فرمان آ جانا، ویسے احسان حسنِ سلوک کو کہتے ہیں۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھیں تو ہزار جلوے نظر کے سامنے ہیں لیکن اتنی فرصت اور تاب و تواں کہاں ہے کہ ہم دیکھیں اور دیکھنے کا احسان اٹھائیں۔ یہ دراصل ان لوگوں پر طنز ہے جو حقائق کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ غور و فکر کرنا نہیں چاہتے اور اس کو اپنے لیے غیر کا احسان اٹھانے کے برابر سمجھتے ہیں۔

شعر نمبر (۲) ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

مشکل الفاظ:

سنگ:	پتھر	برات:	حصہ
معاش:	روزی	جنونِ عشق:	عشق کا جنون
ہنوز:	ابھی تک، اب تک	منتِ طفلاں:	بچوں کا احسان

تشریح:

ابھی تک پتھر کھانے پر عاشقوں کی زندگی کا انحصار ہے۔ یہاں پتھر کھانا محاورے سے غالبؔ نے خیال پیدا کیا ہے اس لیے کہ معاش کھانے پینے کا عمل ہے۔ اگر پتھر کھانے پر ہی زندگی کا مدار رہ جائے گا اور پتھر بچے ماریں گے تو روز اول سے اور ہم ابھی تک بچوں کے پتھر کھا رہے ہیں۔

شعر نمبر (۳) دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم

اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

مشکل الفاظ:

بار:	بوجھ	منتِ مزدور:	مزدور کا احسان
خم:	جھکا ہوا	خانماں:	گھر بار
خراب:	تباہ حال		

تشریح:

ہرگز کسی کا احسان نہ لو۔ تم تو آدمی ہو۔ دیواریں تک احسان کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتیں اور خم ہو جاتی ہیں۔

پیٹھ پر زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے تو آدمی اسے جھک کر اٹھاتا ہے۔

یہاں دونوں شعروں میں تین بار ایک ہی بات آئی ہے۔ منت کا لفظ دہرایا گیا ہے۔

شعر نمبر (۴) یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے

یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

مشکل الفاظ:

زخم رشک: رشک کے جذبے کا پیدا کردہ زخم

رسوا: بدنام

پردۂ تبسم: مسکراہٹ کا پردہ

پنہاں: چھپا ہوا

تشریح:

پورے شعر کی فضا بڑی حد تک گنجلک ہے۔ زخم رشک کو رسوا کرنا اردو میں کہیں دور دور مستعمل نہیں ہے۔ غالب کا اپنا خیال ہے اور کسی نفسیاتی پیچیدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ محبوب کا تبسم پنہاں کس کے لیے ہے کہ غالب کو اپنا زخم رشک یاد آیا اور اس نے محبوب سے شکوہ کیا کہ ہر بات تم نے پردے میں رکھ چھوڑی ہے۔ میں اس پر رشک کرتا ہوں اور تمہارے ذریعے میری رسوائی ہوتی ہے۔

غزل نمبر:۳

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم؟
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

....

شعر نمبر(۱)بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

مشکل الفاظ:

بساط: مسند، چاندنی، مالی حیثیت، اثاثہ

عجز: انکساری، عاجزی

باندازِ چکیدن: ٹپکنے کے انداز سے

سرنگوں: سر جھکائے ہوئے

تشریح:

ہمارے پاس زندگی کے سرمائے یا سروسامان میں کہ سوائے ایک دل کے کچھ نہیں تھا۔ اب وہ بھی آنسو

کی طرح خون کی بوند بن کر ٹپک جانا چاہتا ہے اور سرنگوں رہتا ہے۔ یعنی ہم اس کے بھی محروم ہوتے جاتے ہیں۔

شعر نمبر (۲) رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلیف سے

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مشکل الفاظ:

آزردہ:	افسردہ خاطر، ناخوش، شکر رنجی کے ساتھ
چندے:	کچھ دن، کم وقت
برطرف:	ایک طرف

تشریح:

ہم اپنے محبوب سے خفا کیسے ہو سکتے ہیں اور جتنے دن ہم خفا رہے وہ بھی یہ کہیے کہ ایک طرح کا تکلف تھا اور اس کو بھی اگر ہم آزادی سے بات کریں تو ہمارے والہانہ شوق ہی کے انداز کا ایک حصہ تھا۔ اس طرح کے رویے اپنائیت کے زیر اثر ہی اپنائے جاتے ہیں۔

شعر نمبر (۳) خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے

مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

مشکل الفاظ:

خیالِ مرگ:	موت کا خیال	تسکین:	سکون
دلِ آزردہ:	افسردہ دل	دامِ تمنا:	تمناؤں کا جال
صیدِ زبوں:	بہت معمولی سا شکار		

تشریح:

موت کا خیال میرے افسردہ دل کو تسکین نہیں بخش سکتا۔ لیکن جن باتوں کی میں تمنا رکھتا ہوں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے یہ ایک ہے۔ ذوق کے شعر کو دیکھئے تو اس میں بھی یہی خیال ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شعر نمبر (۴) نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم؟
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

مشکل الفاظ:

باعث: وجہ افزائش: بڑھنا
دردِ دروں: دل کا درد

تشریح:

کاش میں نالہ و فریاد نہ کرتا، ضبط کیے رہتا۔ مگر میں یہ سمجھتا تھا کہ اس سے تسکین ہوگی جب کہ ہوا اس کے بالکل الٹ اور میرا نالۂ نیم شب میرے درد اور دکھ کو بڑھانے کا سبب بن گیا۔

شعر نمبر (۵) مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مشکل الفاظ:

مے: شراب عشرت: خوشی، مسرت، عیش و آرام
ساقی: شراب پلانے والا گردوں: آسمان

جام واژگوں: الٹے پیالے۔ دستور تھا کہ جب شراب پینے کی خواہش نہیں ہوتی تھی تو پیالہ الٹا رکھ دیا جاتا تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس محفل کو اب ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آسمان الٹے پیالے کی طرح ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہاں محفل شراب ختم ہو چکی ہے۔

تشریح:

آسمان سے ہم عیش و عشرت کی خواہش کیا کریں اور کیسے کریں کہ اس نے تو پیالے الٹ کر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ بھی دو چار یعنی اس کی محفل میں اب کچھ ہے ہی نہیں، ہم خواہش کر کے بھی کیا کریں گے اور ہمیں کیا مل جائے گا۔

غالبؔ کی شاعری (جدت پسندی)

غالبؔ کی اردو شاعری اس وقت سامنے آتی ہے جب روایتی شاعری کا ایک طرح سے نقطۂ عروج آچکا ہے۔ سوداؔ اور میرؔ کے بعد آتشؔ و مصحفیؔ کا دور آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری میں نئے پہلو ابھر رہے ہیں۔ ان میں مشکل بھاری ردیف اور قافیے ہیں۔ یہ شاعرانہ طبع آزمائی اور استادانہ فکر فرمائی کے اظہاری وسائل ہیں اور وہ کیفیت ہے جس کے لیے ایک مرثیہ نگار شاعر نے کہا ہے۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یعنی ایک زمین "طرح" ہوتی ہے تو اس پر مسلسل فکر جاری رہتی ہے۔ آتشؔ کے یہاں ایک ایک زمین شعر میں کئی کئی غزلیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی طرح میں کئی کئی غزلیں لکھنا صرف مشق سخن کو آگے بڑھانا ہے اور اس طرح استادانہ مذاق کو پیش کرنا ہے کہ ایک ایک غزل سات سات مطلعوں پر مشتمل ہو اور شعروں کی تعداد آگے بڑھ کر سات شعروں سے ستر شعروں تک پہنچ جائے۔ اب کوئی غزل نو شعری ہو سکتی ہے، گیارہ شعری ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ پچیس شعری۔ جب کہ غزل کا مزاج پچیس شعروں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اس دور میں بات پچپن شعروں تک پہنچ گئی اور بات اس سے آگے بڑھ گئی۔ ظاہر ہے کہ غزل اور غزلیہ شاعری کا حسن ان غزلوں میں ختم ہو گیا اور صرف استادانہ شعر گوئی کا انداز باقی رہا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مشکل بھاری ردیف قافیوں نے شعر کو جذبے اور احساس سے الگ کیا اور صرف لفاظی اور نئے سے نیا مضمون تراشنے کی کوشش نے اس کی جگہ لے لی۔ جس کی وجہ سے شاعری صناعی بن کر رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی ادرت پسندی اور طرفہ کاری تھی لیکن اس کے ذریعے سامنے آنے والی غزل کے اپنے شعری حسن لطف اور زبان و بیان کی کشش سے بہت کچھ محروم ہو گئی۔ غالبؔ کے یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ غزل کو اس کی "تخلیقی صنعت" اور غزلیت کے شاعرانہ حسن سے پھر قریب لاتے ہیں۔ ان کی غزلیں عام طور پر مختصر ہوتی ہیں۔ ردیف اور قافیوں میں مشکل بھاری انداز نہیں ہوتا جو اس زمانے کی استادانہ غزلوں میں بہت نمایاں حیثیت سے سامنے آچکا تھا اور جس کی لے برابر آگے بڑھ رہی تھی۔

انھوں نے زبان کی آرائش اور بیان کی سجاوٹ کو بھی پیش نظر رکھا کہ آخر شعر کی زبان خوب صورت اور دل آویز تو ہونی ہی چاہیے لیکن وہ صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ ہو جس کے شعری معنی اور تخلیقی فضا کچھ بھی نہ ہو اس سے کیا فائدہ۔ جب قول، غزل ہی ندرت اور اپنے معنی اور معنویت سے محروم ہوگی تو وہ منظوم کلام تو بے شک ہے لیکن اپنے ادبی معنی اور معنویت سے محروم ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دینا غالبؔ کی جدت فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گنجینہ خزانے کو کہتے ہیں اور لفظ کو گنجینۂ معنی کہنا اور زیادہ اہم اور معنی خیز بات ہے اور غالبؔ نے اس سے بھی کچھ زیادہ آگے بڑھ کر گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعوری یا نیم شعوری طور پر "Potency of Word" کو اہمیت دیتے ہیں۔ لفظ اپنے معنی کے اعتبار سے صرف لغت کا پابند نہیں ہوتا۔ لغت میں الفاظ کے جو معنی ہوتے ہیں وہ اکثر بہت سادہ اور عام سطح سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ان سے لفظوں کی معنیاتی گہرائی اور گیرائی کا پتہ نہیں چلتا۔

لفظ اصطلاح بھی بنتا ہے جہاں کسی علم، کسی فن اور کسی فکر و فلسفے کے دائرے سے اس کا خاص تعلق ہو جاتا ہے اور اس فن سے متعلق ایک وسیع تر معنی اور تہہ دار مفہوم اس سے معنوی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ اصطلاح کے علاوہ لفظ روایت کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے اور تلمیح بن جاتا ہے۔ تلمیح جو نیم تاریخی یا نیم افسانوی واقعہ ہوتا ہے۔ لفظ کا استعمال صوتی اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور ترکیبی خوش آہنگی کے اعتبار سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ لفظ ایک علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تشبیہ اور استعارہ بھی ایک طرح کی علامت ہوتا ہے اور شاعری میں تو تشبیہ، استعارہ اور علامت بہت کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ کے ان شعروں کو اگر یاد کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ غالبؔ جدت فکر کے کیا معنی لیتے ہیں اور کس سہارے پر وہ باتیں کرتے ہیں جو ان کی جدت فکر کی ترجمان ہوتی ہیں۔

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب اس سے پتہ چلتا ہے کہ شعر میں مضمون اور مضامین حال و خیال کے کیا معنی ہیں اور ان کو پیش کرتے وقت کس طرح اس معنویت کا خیال رکھا جاتا ہے جو کسی بھی لفظ کے معنی سے لغوی طور پر وابستہ ہوتی ہے لیکن شعر صرف لغت اور قواعد کا پابند نہیں ہوتا کہ بات محبوب کے غمزہ و ناز کی ہوگی، اس کے عشوہ و ادا کا اس میں ذکر ہوگا۔ لیکن ہم اسے صرف عشوہ و ادا نہیں کہیں گے، غمزہ و ناز ہی کہہ کر یاد نہیں کریں گے بلکہ دشنہ و خنجر کہیں گے، تیر و نشتر کہہ کر شعر میں اس کی طرف اشارہ کریں گے، اسی سے بیان میں لطف پیدا ہوگا اور خیال زیادہ حسین ہو جائے گا۔ اس میں تصور اور تاثیر کو زیادہ دخل ہوگا۔

شاعری ایک طرح کی تصویر سازی ہے یعنی ایک خیال کو جو نظر نہیں آتا، سنا نہیں جا سکتا، چھوا نہیں جا سکتا اور اس کو لفظوں کی ایک ایسی شکل دیتا ہے جس سے کوئی تصور تاثر کا درجہ حاصل کرے۔ ایک امیج Image بھی بن جائے اور ذہن ایک طرح کے Impression کو بھی اپنی سطح پر محفوظ کرے۔

ہمارے اپنے تجربات دوسروں سے الگ نہیں ہوتے کہ وہ انسانی تجربات ہوتے ہیں۔ مگر وہ شعر ہو، موسیقی ہو، مصوری ہو جو فنون لطیفہ کہلاتے ہیں، ان میں وہی عام تجربہ ایک نئی شکل، ایک نیا رنگ اور ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے جو خیال کو تصور اور تصویر اور تصویر کو تاثیر میں بدل دیتا ہے۔ ہم سوچ سے آگے بڑھ کر ایک خیال پیدا کرتے ہیں اور خیال کو الفاظ یا رنگ یا action کے ذریعے پھر اپنے ایک نئے تاثر اور تصور میں ڈھال دیتے ہیں، خیال کو حال بناتے ہیں اور حال کو خیال۔ اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کے من کی بات کہتے ہیں اور یہ بھی کہ اس میں ایک نیا رنگ پیدا کرتے ہیں۔ اور اسی کو جدت پسندی کہتے ہیں۔ غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شعر کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ دل سے نکلتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے "از دل خیزد بر دل ریزد" لیکن ضروری نہیں کہ بات ایک ہی انداز سے کی جائے۔ ہم پہلو بھی بدل سکتے ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر آپ کو یاد آ رہا ہوگا۔

وہی اک بات یاں موجِ نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یعنی وہ بھی ایک میرے سانسوں کا سلسلہ ہے۔ موجِ نفس سانسوں کے سلسلے کو کہا گیا ہے اور وہاں پھولوں کی خوشبو ہے۔ اس طرح چمن کا جلوہ میری خوب صورت شاعری اور رنگین شعروں کا باعث ہے۔ یہ خیال بھی ہے اور نیا تصور بھی، تجربہ بھی اور تاثر بھی۔ اگر آدمی خوب صورت چیزوں کو نہ دیکھے تو خوب صورتی کا احساس کیسے پیدا ہو۔ اگر حسین اشیا کو چھوئے نہیں یا پتھر اور ریشم کے لمس میں وہ فرق کیسے کرے۔

اس تجربے کو جب وہ نئے انداز سے پیش کرتا ہے تو یہی جدت طرازی ہوتی ہے۔ کہنے کے اعتبار سے بات کا نیا پن ہوتا ہے۔ عام خیالات اور حالات سے نیا نتیجہ نکالنا ہوتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ تو سب دیکھتے ہیں کہ شمع اندھیروں کو دور کرنے کے لیے جلائی جاتی ہے لیکن شمع کو جلتے ہوئے دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ یہ ہماری زندگی کے غموں کو پیش کرتی ہے ایک نئی بات ہے۔ ایک طرح کی جدت طرازی ہے کہ شمع جلتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسروں کو روشنی دیتی ہے اور اس کے آنسو بھی بہتے رہتے ہیں۔ اس کی آنکھیں گویا ساری رات چشمِ نم کا منظر پیش کرتی ہیں۔

ہم بھی تمام زندگی غموں کی آگ میں جلتے ہیں اور چراغ و شمع کی طرح روشن رہتے ہیں۔ زندگی کی اندھیری رات میں روشنیاں پھیلاتے ہیں اور اس کا سلسلہ پیدائش سے لے کر موت تک جاری رہتا ہے۔ اسی کو غالبؔ نے بجز مرگ علاج کہا ہے کہ سوائے موت کے جلنے کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا کہ موم بتی یعنی شمع ہر رنگ میں صبح تک جلتی رہتی ہے۔

شمع کو بجھا بھی دیا جاتا ہے تو وہ ایک نیا سوال بن کر سامنے آتی ہے کہ آخر اس کی زندگی ختم کیوں کی گئی، اس کی روشنی کے شعلے کو کیوں بجھا دیا گیا۔ تو غالبؔ نے ایک نئے انداز سے اس خیال کو پیش کیا، اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے۔

میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

یہاں داغِ ناتمامی کے معنی اس افسردگی کے ہیں، اس گہرے دُکھ کی طرف اس کے ذریعے اشارہ ہے کہ وقت سے پہلے کسی کو موت آجائے اور اس کی زندگی اس بات کی علامت بن جائے کہ وہ ناتمام رہی۔

غالبؔ کے اس شعر کو آج کل بہت سراہا جاتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جام ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

زندگی کا ہر منظر مجھے چھلکتے ہوئے جام اور مہکتے ہوئے پھول کی طرح نظر آتا ہے۔ میرے سینے میں کیسے جذبات سے بھرا ہوا دل ہے کہ مجھے ہر شے حسین، دل آویز اور خوب صورت نظر آتی ہے۔ یہ دل میرا ہے یا پھر اس بنانے والے کا دل ہے جس نے ان تصویروں کو سجایا ہے اور ذرّے سے لے کر ستاروں تک ہر شے کو ایک عجیب سے حسن سے آراستہ کیا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ دل نہ ہو تو جذبات کہاں سے آئیں اور جذبات نہ ہوں تو زندگی کے حسن کو ہر شے کی دلکشی اور دل آویزی کو کیسے محسوس کیا جائے۔ یہ تو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہو کر سامنے آتی ہیں۔ دل ہے تو نظر ہے، نظر ہے تو تصویر ہے، تصویر ہے تو تاثر بھی ہے۔ ہم جذبے اور احساس سے خالی ہو کر اپنی بات نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ سمجھا سکتے ہیں۔

جذبہ ہمارے خیالات کو نئے سے نئے تاثر اور تصور میں ڈھالتا رہتا ہے۔ اسی کو شاعر اعلیٰ خیالات سے خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دیتا اور اپنا فنکارانہ جدت طرازی ہے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اب شمع کے بجھ جانے کو داغِ فراق سے جل بجھا کیا ہے اور شمع خاموش کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

شمع افسردہ ہی کو شمع خاموش کہا جاتا ہے۔

غالب کے چند اور شعر دیکھئے جن میں ان کی جدت طرازیاں سامنے آتی ہیں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

محبوب کا رخصت ہونا ایک محبت کرنے والے کے لیے قیامت سے کم نہیں۔ یہ قیامت ایک مرتبہ ہی نہیں بلکہ ہزار بار اگر کسی کے دل پر گزرے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اب یہاں غالب نے قیامت کے گزرنے کا تو ذکر کیا لیکن محبوب کے سفر کا نہیں بلکہ اس لمحے کے یاد آنے کی طرف اشارہ کیا۔

زندگی ہمارا حصہ بنی ہے۔ ہمارے صبح و شام، دن اور رات اس کے ایک ایک لمحہ سے گزرتے ہیں۔ کوئی وقت بھی تو ایسا نہیں ہوتا جب ہم زندگی کے ساتھ نہ ہوں اور زندگی ہمارے ساتھ نہ ہو۔ یہاں تک کہ سوتے وقت بھی سانس چلتی رہتی ہے۔ دل دھڑکتا رہتا ہے اور دماغ خوابوں کی صورت میں سوچتا رہتا ہے۔ اس پر بھی انسان یہ قابو نہیں رکھتا کہ وہ ایک لمحہ کو ٹھہرائے۔ کوئی جانتا ہی نہیں کہ اس کا وقت کب اور کہاں آئے گا۔ بس وہ تو زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ غالب نے اس صورت حال کو ایک چھوٹے سے گھوڑے سوار کی حالت سفر سے تشبیہ دی ہے کہ جس کا منہ زور گھوڑا تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہا ہو اور اس مسافر حیات کا ہر لمحہ اس طرح گزر رہا ہو کہ نہ اس کا ہاتھ گھوڑے کی باگ پر ہو اور نہ پاؤں رکاب میں ہو۔ یہ دونوں تو کنٹرول کرنے والی چیزیں ہیں اور انہیں پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ نہ گزرنے والی صبح پر ہم کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ گزرنے والی شام پر۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

غالب کی جدت طرازی نہ صرف یہ کہ خیال اور حال کے مضامین میں سامنے آتی ہے بلکہ لفظی ترکیبوں میں بھی۔ ان کے خیالات کی ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار پر ایک نظر ڈالے تو اس طرح الفاظ اور لفظی ترکیبیں ملتی ہیں۔ "نقش" صرف ایک لفظ ہے لیکن اپنے معنی کے اعتبار سے ایک متحرک تصویر کا درجہ رکھتا ہے

اور فریادی کے لفظ نے اس کے معنی میں نئی وسعت پیدا کر دی ہے۔ شوخی تحریر کی لفظی ترکیب اور زیادہ معنی خیز ہے۔ چونکہ تصویر بھی ایسی ہی پیکر تراشیوں میں آتا ہے اور ان سے بھی بکھا گے بڑھ کر کاغذی پیرہن ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر میں قید حیات و بند غم جیسے ترکیبی الفاظ بھی موجود ہیں جو بہت معنی خیز ہیں اور ان کا مفہوم بھی کہ قید حیات اگر ہے تو بند غم بھی ہے۔ زندگی بھر غموں سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ موت ہی آ کر ان سے نجات دیتی ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جو مندرجہ بالا شعر میں پیش کیا گیا ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جدت طرازی کے یہ معنی بھی ہیں کہ ایک ہی مفہوم کو نئے انداز سے پیش کیا جائے۔ اس لیے کہ تجربہ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کے معنی اور پہلو داریاں ان گنت ہوتی ہیں اور شاعری میں جدت طرازی کا یہی آرٹ سب سے زیادہ سامنے آتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ شعر بھی پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اکائی: ۱۲

غالب کی غزل کے فکری پہلو

غزل عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں محبوبوں سے بات کرنا یا عورتوں سے بات کرنا۔ عربی زبان میں صنف شعر کے اعتبار سے ایک ہی صنف عربی میں رائج تھی۔ اس میں عشقیہ اشعار لکھے جاتے تھے۔ عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا تھا۔ صحرائے عرب کے دل آویز منظر پیش کیے جاتے تھے اور اسی میں امیروں اور قبیلے کے سرداروں اور بہادر افراد کی تعریف کی جاتی تھی۔ آپسی جنگ و جدل کے متحرک منظر نامے بھی ہوتے تھے۔ اس میں رجز خوانی بھی آجاتی تھی اور حدی خوانی (نغمۂ ساربان) بھی۔

جہاں تک فارم کا سوال ہے عربی میں وہی فارم رائج تھی جسے ہم غزل کی ہیئت میں دیکھتے ہیں کہ ہر شعر کا قافیہ ایک ہوتا ہے۔ اس کے باہر کوئی قافیہ یا ردیف استعمال نہیں ہوتی۔ شعروں کی تعداد بھی متعین نہیں ہوتی۔ یہ صورت عربی شاعری میں بھی تھی مگر عربی شاعری میں ردیف نہیں ہوتی۔

جب عربی شاعری سے متاثر ہو کر فارسی میں شاعری شروع ہوئی تو غزل کے لیے عربی سے ماخوذ کچھ خصوصیات کو ضروری قرار دیا گیا۔ لیکن حال و خیال کے مضامین میں تنوع آتا رہا اور نئے سے نئے مضامین کی طرف توجہ مبذول ہوتی رہی۔

قافیوں کا استعمال ان مضمونوں کی طرف ذہن کو لاتا رہتا ہے۔ شعر کے آخر میں جب قافیہ آئے گا اور ردیف کے ساتھ نسبت رکھنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی تو مضمون سوچنا ہوگا۔ اب جیسی شاعر کی اپنی طبیعت ہوتی ہے، مزاج ہوتا ہے، مطالعہ اور مشاہدہ ہوتا ہے، وہ جن تجربوں سے گزرتا ہے اور نفسیاتی طور پر جو واردے اس کے ذہن اور زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں وہ انھیں کو recall کرتا ہے اور ان کے مطابق کوئی مضمون، کوئی خیال، کوئی

تجزیہ پیش کرتا ہے۔

ہم شاعری پر کسی بھی شخص کی معاشرتی زندگی کو اثر انداز ہوتے ہوئے بہت بے تکلفی کے ساتھ بعد ادائی توجہ دیکھ سکتے ہیں۔ شاعر جب اپنے مضمون کو پیش کرتا ہے تو اپنے مضمون یا خیال کو خوب صورت تشبیہوں اور استعاروں سے بھی سجاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا یا شاعر نہیں کر سکتا تو شعر روکھا پھیکا رہ جاتا ہے۔

غالبؔ نے بھی ایک ذہین آدمی کی رو سے اپنا شعری اور شعوری سفر طے کیا۔ تو ان کے سامنے فارسی شاعری میں آنے والے بہت سے خیال اور بہت سی تعبیریں موجود تھیں۔ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

سب سے پہلی روایت جو شاعری کی بنیادی روایت ہوتی ہے وہ حسن پرستانہ جذبہ تھا۔ کسی بھی حسین شے کو دیکھ کر آدمی متاثر ہوتا ہے اور جب وہ شخص، وہ صورت، وہ تشبیہ آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے تو انسان اسے یاد کرتا ہے اور اپنی یادوں کو اپنے شعروں میں ڈھالتا ہے۔ غالبؔ کے یہاں یادوں کا ذکر بہت بار آیا ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

بات صرف غالبؔ کی نہیں، انسانی نفسیات اور حسیات کی ہے۔ Memory انسان کی زندگی میں بہت دور تک اور بہت دیر تک یادوں کی پرچھائیاں شریک رہتی ہیں، اس کا ساتھ دیتی ہیں اور زندگی کے بیتے لمحوں کو اس کے ساتھ رکھتی ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

اس شعر کے مفہوم میں زندگی کی وہ خوشیاں، دلچسپیاں، محفلیں اور انجمنیں بھی داخل ہیں جو آدمی کو اچھی لگتی ہیں۔ اس کی یادوں میں شریک رہتی ہیں اور وہ ان کو فراموش نہیں کرنا چاہتا اسی لیے ہماری جدید شاعری میں بھی یادوں کا تصور طرح طرح سے کام کرتا ہے۔ جوش نے تو "یادوں کی برات" کے ساتھ اپنی پوری زندگی کو پیش کیا ہے اور سوانح حیات لکھ ڈالی ہے۔ ایک شاعر کے یہاں یادوں کا ذکر اس طرح بھی آیا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یادوں کا رقص، یادوں کے چراغ، یادوں کے موسم، یادِ وطن، یادِ یاراں، نہ جانے کتنے لفظی پیکر ہیں جو یادوں کے مفہوم اور مضمون کو طرح طرح کے بلکہ دھنک کے سے رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر تو بہت ہی معنی خیز اور شور انگیز ہے۔

سنبھلنے دے، ہجومِ نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

دامانِ خیالِ یار کا چھوٹنا یادوں کی دولت سے محروم ہونا ہے اور وہ سب سے بڑی قیامت ہے جو انسان کے دل پر گزرتی ہے۔

یاد اچھے لمحات کی بھی ہوتی ہے اور دکھ بھرے لمحات کی بھی اور ہمارے دکھ سکھ اپنی نرمی اور شدت اور اپنی گرمی کے ساتھ ان یادوں میں موجود اور محفوظ ہوتے ہیں۔

غالب کے مضامین حال و خیال میں ایک اور اہم مضمون فکری پہلوؤں کا انتظار ہے۔ وہ جن باتوں کی تمنا رکھتے ہیں ان کے لیے زندگی میں آمد کے بھی قائل رہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا افسون انتظار، افسون تمنا بھی ہے۔ انتظار ایک عام تجربہ ہے۔ ہر انسان اس سے گزرتا ہے لیکن غالب نے اس سے نئے نئے خیال اور نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں۔ ان کا مشہور شعر۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے یہاں انتظار تجسس بھی ہے یعنی جستجو اور ایک طرح کا داخلی تجربہ بھی Inner Experience اسی لیے وہ تمنا کے ایک قدم کے بعد دوسرے قدم کا انتظار بھی کر رہے ہیں کہ اس کا مرحلہ کب آتا ہے کہ ہم نے اس تمام دشتِ امکان کو صرف ایک نقش سے آراستہ دیکھا ہے۔ دوسرا کوئی اور نقش قدم یہاں موجود ہی نہیں پایا۔ ہم کہیں آگے جا ہی نہیں سکے۔

غالبؔ کے یہاں فکر فرمائی اور خیال آرائی کا ایک اور پہلو جستجو ہے، تلاش ہے، ایک نئی منزل کی تلاش، ایک نئی راہ سفر پر قدم رکھنے کا خیال، جس کو غالبؔ کی اختراع پسندی بھی کہا جاتا ہے اور جدت طرازی بھی۔ وہ کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتے اور وہاں ایک سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں کہ یوں ہے تو کیا یوں نہیں ہو سکتا، اور یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ یعنی وہ سوچ کی نئی راہوں کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔

سوچ کے بنیادی دائرے ہی ہوتے ہیں، تمام وسعتیں اور گہرائیاں ان میں امکانی طور پر بنی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کا فیصلہ ہر مرحلے پر انسانی ذہن کرتا ہے۔ ہر بات پہلے سے طے نہیں ہوتی۔ پانی کے دائرے کی طرح آگے بڑھتی ہے، پھیلتی ہے۔ یعنی تغیر اور تبدیلی غالبؔ کے نزدیک زندگی کا ایک ایسا قانون ہے جو ہر لمحہ اپنے اثرات اور نئی اطراف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

غالبؔ کے یہاں ایک بے حد اہم رجحان یہ ہے کہ وہ ہر بات پر فلسفیانہ انداز سے نظر ڈالتے ہیں اور ایسے خیالات اور سوالات ان کے ذہن کی سطح پر ابھرتے ہیں جو نئے دائرے بناتے ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

زندگی بے ثبات ہے، نقش بر آب ہے، پانی کا بلبلہ ہے۔ جو کچھ ہے وہ مٹنے کے لیے ہے۔ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور اسی پر وہ اپنے فکر اور فلسفۂ حیات کی بنیاد رکھتا ہے۔ غالبؔ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی ہے اور زندگی ایک خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور خواب بھی وجود فلسفۂ خواب کے مرحلے سے بہت قریب ہے۔ چند لمحے میں سب کچھ ختم ہو جانے والا باقی رہنے والی کوئی شے نہیں ہے، جو ہے آرزو ہے، وقتی ہے اور جس کی حیثیت ایک لمحے سے زیادہ نہیں۔ اب یہ غالبؔ کی جدت طرازی ہے کہ

اس میں بھی اس نے ایک نیا پہلو پیدا کر لیا ہے جو بے حد اہم ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یہ ہماری خواہشیں ہیں، تمنائیں اور آرزوئیں ہیں جو ہماری زندگی کو نئے پہلوؤں سے آشنا کرتی ہیں۔ موت اگر نہ ہو تو زندگی بھی بے معنی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے جو غالب کی سوچ کا حصہ ہے۔

غالب مذہب پر یقین رکھتے ہیں، اسلام کو بھی مانتے ہیں۔ حضرت علی سے ان کو غیر معمولی طور پر عقیدت ہے لیکن ایک عام مسلمان کی طرح وہ مذہب کا کوئی بندھا ٹکا تصور نہیں رکھتے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات کو کہ وہ ان کے اہم تہذیبی اور شخصی افکار میں سے ہیں، جب اس شعر کی صورت میں دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف مذاہب کی وحدت اور مختلف عقیدوں کی یگانگت میں یقین رکھتے ہیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

وہ اپنے آپ کو موحد یعنی توحید پرست خیال کرتے ہیں اور اپنی توحید پرستی کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ رسمی قیدوں اور بندشوں سے انکار کر دیں۔ رسمی قیدیں، رسمی باتیں ہوتی ہیں جو اتنی ضروری اور بنیادی نہیں ہوتیں جتنا ان پر زور دیا جاتا ہے۔ غالب کی شاعری کے جو فکری پہلو ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ رسمی باتوں کو نہیں مانتے اور انھیں ذہن و خیال کے لیے ایک طرح کی زنجیریں مانتے ہیں۔ ان کا شعر اس طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
پا بستۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرہاد اگر اپنے سر میں تیشہ مار کر مرا تو کوئی خاص بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ اس نے مرنے کے لیے ایک رسمی طریقہ اختیار کیا اور لوگ اکثر رسمی طریقوں پر ہی زور دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد خیال ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شعر میں کہا ہے۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص سے نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

جس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور اپنی خاص روش پر ناز کرتے نظر آتے ہیں ان کے یہاں بھی گھسے عام باتوں کی پابندی اور پیروی ملتی ہے۔ اس سے آزادی نہیں۔ اس کا ہم یہ مطلب بھی لے سکتے ہیں کہ غالبؔ کے یہاں ایک نہایت اہم پہلو کہ آزادیٔ فکر و خیال کا تصور بھی ہے۔ وہ اپنی آزادیوں کا ذکر خطوط میں بھی کرتے ہیں اور بندگی کے باوجود خود کو اتنا آزاد تصور کرتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

مذہب کے معاملے میں آدمی کو عام طور پر پابند رہنا پڑتا ہے مگر غالبؔ یہاں بھی اپنے لیے ایک گوشۂ آزادی کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ان کی شاعرانہ انانیت بھی ہے اور غیر معمولی ذہانت بھی جو ان کے ذہن کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اسی لیے وہ پابند نہیں ہونا چاہتے اور اس زندگی کو پسند کرتے ہیں جس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

دامِ ہوائے گل ایک مشکل ترکیب بھی ہے اور خوب صورت ترکیب بھی اور اس کا مطلب ہے طرح طرح کی خواہشیں اور اس عالمِ رنگ و بو سے آدمی کے ذہن، زمانے اور زندگی کے رشتے مراد ہیں۔ یہ سب ضروری ہیں لیکن غالبؔ کے نزدیک ان کو ریشم کی بیڑیاں نہیں بننا چاہیے کہ وہ آدمی کے لیے آزادیٔ فکر میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے حلقے بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات کہہ دی گئی کہ غالبؔ کا ذہن ایک فلسفی کی طرح سوچتا تھا تبھی تو وہ بات میں سے بات اور نکتے میں سے نکتہ پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ کے فکری سرمائے میں وقت کا تصور بھی ایک اہم تصور ہے جو ایک وقت میں دھوپ چھاؤں کا تصور پیدا کرتا ہے اور دوسرے وقت میں ایک موہوم نقطہ رہ جاتا ہے۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

دوسرا یہ شعر بھی جو فاصلے سے تعلق رکھتا ہے دراصل وقت ہی سے متعلق تصورات کو پیش کرتا ہے۔ جہاں وہ ہے بھی اور نہیں بھی۔

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

یعنی وقت اور فاصلے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ وقت کا تصور فاصلے کے بغیر نہیں ہوتا اور فاصلے کے تصور سے وقت کا تصور وابستہ ہے۔

یہ شعر جو فاصلے اور وقت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ ذہن پر سفر کا تصور بھی ایک نقش کی طرح چھوڑ جاتا ہے۔ سفر بھی غالبؔ کے افکار میں ایک اہم فکری پہلو اور ذہنی کارفرمائی کا ایک جزو ہے۔ ان کے یہاں سفر اپنی کوئی حد نہیں رکھتا، وہ مسلسل ہے، برابر ہے اور کہیں ختم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جب وہ پابند نہیں، گرفتارِ زنجیر ہیں تب بھی ان کا ذہنی سفر جاری ہے۔

بس کہ غالبؔ ہوں اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا
کر دیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

سفر کا خیال غالبؔ کے یہاں محبوب کے سفر سے بھی وابستہ ہے، زندگی کے سفر سے بھی اور ذہن و فکر کے سفر سے بھی۔ ان کا یہ مصرع اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یعنی وہ خود زنداں میں تھے اور ان کا خیال سفر کر رہا تھا بلندیوں کی طرف ان کے خیالات کی پرواز بھی ایک سفر ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

(غالبؔ کی صوفیانہ شاعری بھی ان کے فکر کا ایک نہایت اہم پہلو ہے لیکن اس پر گفتگو ایک الگ عنوان کے تحت آرہی ہے۔) ان کی شاعری میں فکر کے جو مختلف پہلو ہیں ان کی طرف مختصر مضمون میں اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔

غالبؔ ہوں یا کوئی دوسرا شاعر سب کے یہاں دو طرح کے فکری پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زمانے میں عام طور سے ذہنوں پر ابر پاروں کی طرح چھائے ہوئے خیالات ہوتے ہیں دوسرے جو اس کے لیے اپنے محبوب موضوعات فکر و نظر ہوتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں جو افکار ملتے ہیں وہ تمام تر بے شک وہی ہیں مگر ان کو جس کاوش کے جن مراحل سے گزارا گیا اور جن پہلوؤں پر غالبؔ نے زور دیا، نیا پن پیدا کیا، وہ ان کی اپنی شاعرانہ فکر فرمائی اور خیال آرائی کا حصہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اکائی: ۱۳

غالب کی اردو شاعری

(مشکل پسندی)

غالب عہد ظفر کے بہت اہم شاعروں میں سے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی اردو سے خصوصی طور پر وابستہ نہیں کیا۔ ان کی نفسیات کچھ عجیب سی تھیں۔ وہ فارسی کے قائل تھے مگر ہندوستان کے فارسی جاننے والوں کو شاعری اور ادب نگاری کے حوالے سے کوئی بڑا درجہ نہیں دیتے تھے۔ ان کے دوستوں میں مولوی فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جیسے فارسی داں اور ادب نواز موجود تھے۔ وہ ان کی قدر بھی کرتے تھے مگر ان کا ذہن اسی سطح پر کام کرتا تھا کہ فارسی جب تک مادری زبان نہ ہو وہ کسی کو نہیں آتی۔

اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر غالب کی شاعری کو سمجھنے میں ان کی اس ادبی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبی شعور کے اس پہلو پر نظر داری ضروری ہے۔ انھوں نے شروع شروع میں اردو میں شعر گوئی کی اور مشکل پسندی کا شکار رہے۔ خود ان کا اپنا شعر ہے جو ان کی ذہنی صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے ۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ شعر زبان و بیان کے اعتبار سے سادگی اور زبان کی شگفتگی کا خود ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے مگر اس کے وسیلے سے انھوں نے جو شاعری کی اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ کو سامنے رکھ کر وہ پیچیدہ زبان اور مشکل پسندانہ انداز بیان کی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ یہ ہ نمونہ جس سے غالب اپنی شاعری کے مختلف ادوار میں وابستہ رہے اور اس کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔

اگرچہ بقول حالیؔ ان کے دوست ان سے آسان کہنے کی فرمائش کرتے رہے اور کرتے تھے، غالب نے خود بھی اپنے ایک اردو قطعہ میں جسے ہم رباعی بھی کہہ سکتے ہیں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اے غالبؔ میرا کلام چوں کہ بڑی حد تک مشکل ہے، اسے سخنوری یعنی اچھے اچھے استاد یا کامل فن شخصیتیں مجھ سے آسان کہنے کی خواہش کرتی ہیں اور فرمائش ہوتی کہ میں آسان کہوں۔ اب میں یہ کہتا ہوں تو مشکل ہے اور نہیں کہتا ہوں تو مشکل ہے۔ آخری مصرعہ بالکل فارسی میں ہے اور باقی مصرعوں میں اس مشکل گوئی کی طرف اشارہ ہے جس سے اس زمانے کے اہل فن اختلاف کرتے ہیں۔

حالیؔ نے مولوی عبدالقادر، حنیف رامپوری اور بعض غالبؔ کے دوستوں کی طرف سے اس فرمائش کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی مشکل پسندی دوسروں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ خود غالبؔ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یعنی میں کسی سے تعریف اور تحسین کی توقع نہیں رکھتا اور نہ مجھے اس کی پرواہ ہے کہ کوئی میری شاعری کا اور مدح نگاری کے صلے میں انعام و اکرام کا خیال کرے اور مجھے نوازے تو اب اس کی بھی کیا ضرورت ہے کہ میں اپنی شاعری میں لفظ اور معنی کے اعتبار سے وہ خوبیاں پیدا کروں جو دوسروں کو پسند آئیں۔

ایک اور موقع پر طنز کرتے ہوئے انھوں نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

علم و آگہی چاہے کتنی ہی کوشش کریں اور جال بچھائیں مگر میرے عالم تقریر تک نہیں پہنچ سکتے کہ اس کا مدعا تو عنقا ہے۔ عنقا ایک فرضی پرندہ ہے جو کہنے کے لیے موجود ہے مگر حقیقتاً اس کی رسائی ممکن نہیں۔ ہم ان کے اس شعر کو بھی ان کے انداز فکر کا عکاس خیال کر سکتے ہیں۔

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اس شعر کے لیے یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے دوسروں کی غلط اندیشی، غلط فہمی اور غلط بیانی کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے یہاں مضامین کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں کیا کہا جائے کہ یہ تو نالے کو رسا باندھنے والے لوگ ہیں کیوں کہ اگر نالے کی رسائی ہو جائے تو وہ نالہ ہی نہیں رہے گا۔

اسی غزل میں غالبؔ نے خود یہ مصرعہ کہا ہے ؎

ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

یہاں ہوا کو باندھنے سے مراد خواہ مخواہ کی دھونس داری ہے اس لیے کہ ہوا کو باندھا نہیں جا سکتا ہے اور ایسی ہی باتوں کو ہوا میں گرہ لگانا کہتے ہیں۔ ہوا میں تیر چلانا بھی اسی طرح کا ایک محاورہ ہے۔

دوسرے لوگوں کی زبان پر بھی طنزیہ طور پر ایسے شعر آتے رہتے تھے۔

کلام میرؔ سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہاں میرؔ و مرزا سے مراد میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ ہیں جو اس دور میں اردو شاعری کے لیے سند و اعتبار کا درجہ رکھتے تھے۔ غالبؔ نے اپنی اردو شاعری میں میرؔ کی بھی پیروی کی ہے مگر ان کا اسلوب وہ اختیار نہیں کر سکے اور وہ کر بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ ان کا مزاج، ان کا فکری ماحول اور افتادِ طبع میرؔ سے مختلف تھے اور ان اداروں سے وہ وابستگی رکھتے تھے وہ بھی میرؔ کے حزنیہ اور خاص طرزِ ادا کو صرف رواجاً سراہ لیتے تھے، حقیقتاً اور عقیدتاً نہیں، اس لیے کہ ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور ظفرؔ کوئی بھی میرؔ کا منفرد لہجہ نہیں اپنا سکا۔ (کسی شعر میں جھلک آجائے یہ دوسری بات ہے)

غالبؔ کی اپنی طرزِ ادا اور ان کے اسلوبِ شعر گوئی کا معیار دوسرا تھا۔ وہ فارسی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ فارسی کے اہلِ زبان کے معترف تھے اور اردو کے اہلِ زبان کو اس لیے کم درجہ دیتے تھے کہ ان کی شاعری میں مضمون آفرینی، خیال آرائی اور معنی بندی کا عنصر بہت کم تھا۔

یہ بات بڑی حد تک غلط بھی نہیں تھی لیکن اس کے لیے غالبؔ نے مشکل زبان کو جس حد تک اپنایا وہ اُردو کے شعری لب ولہجہ اور اہلِ زبان کے روز مرہ اور محاورے پر پورا نہیں اترتا تھا۔ یہی وجہ اختلاف تھا اور آسان کہنے کی فرمائش ان لوگوں کی طرف سے بھی کی جاتی تھی جو نسبتاً سنجیدہ لوگ تھے اور جن کے ادبی ذہن اور شعری زبان کو اس وقت پسند کیا جاتا تھا اور معیار قرار دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ ایسے نہیں تھے جن کی رائے اور خیال کو اس دور میں دوسرا درجہ دیا جا سکے۔

غالبؔ کی اُردو شاعری کا ایک قابلِ لحاظ اور لائقِ توجہ حصہ زبان کی دشواری، خیال کی پیچیدگی اور فکر کی بلندی کے اعتبار سے عام لوگوں کے لیے مشکل یا غیر معمولی طور پر مشکل ہو گیا ہے کہ اس میں فارسی الفاظ اور ان سے بھی کچھ زیادہ فارسی تراکیب کی کثرت ہے کیوں کہ فارسی کا مذاق اور اس زبان سے واقفیت کم ہوتی جا رہی ہے، اس لیے غالبؔ کی شاعری مشکل نظر آتی ہے اور ان کے اپنے زمانے میں فارسی کی پیچیدہ ترکیبوں کی وجہ سے اسے مشکل پسندانہ خیال کیا جاتا تھا اور سننے یا پڑھنے والوں کو بے محاورہ زبان اور روز مرہ کے خلاف وہ لب ولہجہ اجنبی معلوم ہوتا تھا۔

غالبؔ نے دوسروں کے کہنے پر یا خود اس کا احساس کر کے اپنے کلام کا انتخاب کیا اور بہت سا حصہ اس میں سے نکال ڈالا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے جو بعد میں شائع ہوا۔ غالبؔ نے اس کی طرف خود بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ ایک عرصے تک مضامین خیالی باندھتے رہے اور جب انھیں اس امر کا احساس ہوا کہ ان کی یہ روش صحیح نہیں ہے تو اپنے دیوان کا انتخاب کر کے بے حد پیچیدہ اور مشکل پسندانہ کلام کو انھوں نے خود اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔

''نسخۂ حمیدیہ'' کی سیر کے ذریعے با آسانی یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ غالبؔ کی مشکل پسندی اور طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنے کی روش آ خر کیا تھی۔

کبھی کبھی تو ان کی زبان بالکل فارسی کے مصرعوں میں ڈھل ڈھلائی ہوتی تھی اور ایک لفظ اگر شعر کی زبان میں سے بدل دیا جائے تو وہ پورا فارسی شعر ہو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اُردو کے لیے یہ زبان یا لہجہ صحیح نہیں تھا اور اس سے ہماری شاعری کی زبان سادہ، سلیس اور خوش آہنگ ہونے کے بجائے پیچیدہ، مشکل اور اجنبی الفاظ سے

گراں بار نظر آتی تھی۔

غالبؔ کے موجودہ دیوان میں بھی ایسے شعر موجود ہیں جو زبان کی اس اجنبیت اور پیچیدگی کے لحاظ سے عام فہم نہیں ہیں اور اردو لب ولہجہ بھی اس سے متاثر ہے۔ جیسا کہ یہ شعر اس سے پہلے پیش کیا گیا ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس شعر میں مشکل پسندی کے ماسوا دام شنیدن جیسی لفظی ترکیب بھی ہے جس میں شنیدن مصدر داخل ہے۔ فارسی مصدروں کا اردو میں استعمال کہاں تک جائز ہے یہ خود غالبؔ کے سوچنے کی بات بھی تھی۔

اسی طرح اس غزل کے یہ تین شعر۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دوسرے شعر میں کاو کاو کی ترکیب بھی غزل کے لحاظ سے خوب صورت ترکیب نہیں ہے اور "نہ پوچھ" کو اگر مپرس سے بدل دیا جائے تو پورا مصرعہ فارسی کا ہو جاتا ہے اور جوئے شیر لانا بھی فارسی محاورہ ہے۔ جوئے شیر آوردن۔ جذبۂ بے اختیار شوق بھی ایسی ہی ترکیب ہے اور سینۂ شمشیر سے دم شمشیر کا باہر ہونا آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔

اس غزل کا مقطع بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔

بس کہ ہوں غالبؔ، اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

آتش زیرپا اور موئے آتش دیدہ جیسی ترکیبوں کے علاوہ جو خیال اس شعر میں پیش کیا گیا ہے وہ خود اپنے طور پر پیچیدہ ہے۔ یہ شعر نسبتاً آسان ہیں مشکل شعر اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہیں اور زبان کے اعتبار سے اجنبی یہ چار شعر ملاحظہ ہوں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یہ شعر غالبؔ کے مروج اور مقبول دیوان میں موجود ہیں مگر بیشتر پڑھنے والے ان سے گزرتے وقت اس پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ "نہ آیا بروئے کار"، "بروئے کار" آمدن کا ترجمہ ہے جو فارسی محاورہ ہے اور دوسرا مصرعہ سرتاسر فارسی ہے۔ تھا کو بدل دیا جائے تو یہ مصرعہ اردو کا مصرعہ نہیں رہتا۔ اس کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ بھی فارسی الفاظ اور نقشِ سویدا جیسی ثقیل ترکیب سے آراستہ ہے۔ اور دوسرا مصرعہ بھی "داغ کا سرمایہ دود" تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے فکر کے پیچیدہ مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو شعر اس غزل میں موجود ہیں ان میں سے ایک شعر میں "داغِ عیوبِ برہنگی" جیسی ثقیل ترکیب بھی ہے اور یہ مصرعہ بھی۔

میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

مقطع کا دوسرا مصرعہ سرتاسر فارسی ہے اور تھا کی جگہ اگر بود لگا دیا جائے تو یہ اردو کا نہیں فارسی کا مصرعہ ہو جائے گا۔

اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ غالبؔ کے یہاں مشکل پسندی نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں

اور خاص طور پر زبان، ان کے اُردو اشعار میں کس سانچے میں ڈھل گئی۔ زبان کو نئے خیالات، نئے الفاظ اور نئی تراکیب دینے کا عمل ایک دوسری صورت ہوتی ہے لیکن مشکل الفاظ کی اگر اس بار اس دائرے میں نہیں آتی اور غالبؔ کے غیر منتخب دیوان کی بات تو الگ رہی منتخب دیوان میں بھی ایسے بہت شعر ملتے ہیں جو الفاظ معنی کے اعتبار سے تشریح طلب ہیں اور معنی فہمی سے پہلے لغت اور علمی اور فکری پس منظر کی وضاحت چاہتے ہیں۔

غالبؔ کی شاعری کا یہی وہ پہلو تھا جس پر اس زمانے کے اہلِ زبان اور اربابِ فن اعتراض کرتے تھے

غالبؔ کی غزل میں تصوف کے نشانات

تصوف ایک روحانیت پسند انہ رجحان ہے جس کا یہ بنیادی مقصد قرار پاتا ہے کہ انسان خود کو خدا تک پہنچائے اور مادی تقاضوں سے جس حد تک ممکن ہو بلند ہوتا جائے۔ اس کی ذہنی اور نفسیاتی سطح کو پستیوں سے اس کو دور اور دور تر کردے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادہ پرستی انسان کو خود غرضی سکھاتی ہے اور خود غرضی طرح طرح کے اخلاقی عیوب کی طرف لاتی ہے اور ایسے قید و بند میں پھنسا دیتی ہے جن سے انسان کا نجات پانا آسان نہیں رہ جاتا۔

اگر دیکھا جائے تو انسانی معاشرے کی زیادہ تر برائیاں، کمزوریاں اور خامیاں اس کی مادی ضرورتوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان ضرورتوں کو انسان جتنا آگے بڑھاتا ہے اتنا ہی وہ اخلاقی حدود کو توڑتا ہے اور غیر اخلاقی، غیر انسانی رویوں سے اپنی زندگی کے رشتے جوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس جوڑ توڑ میں اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ اس کے اپنے جائز حق اور صحیح حدیں اس کے اپنے معاشرے میں اور انسانوں کے درمیان کیا ہیں جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔

ان میں اس کے خون کے رشتے بھی داخل ہوتے ہیں، کام کے رشتے بھی اور محض نام کے رشتے بھی۔ آخر جو ہمارے کاروباری رشتے ہیں خرید و فروخت ہے، لین دین ہے قرض ادھار ہے، یہ سب کام کے رشتے ہیں اور ہماری ذات پات اور رنگ و نسل، حسب نسب بڑی حد تک نام کے رشتے ہیں۔ انھیں سے مل کر ہمارا معاشرہ بنتا ہے اور انھیں سے معاملہ کرنے کے لیے اخلاقی نظام وجود میں آتا ہے۔

فلسفہ، مذہب، دھارک نیم ان سب باتوں کا مقصد اخلاقی نظام اور معاملات کو درست کرنا اور درست رکھنا ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کو کامیابی ہوتی بھی ہے، نہیں بھی ہوتی۔ یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ اگر آدمی مادی قدروں سے بلند ہو جائے اور ان کے بیچ و بچاؤ کے میں اپنے ذہن اور زندگی کو نہ الجھائے تو اخلاقی بلندیاں اس کے حصے میں آسکتی ہیں اور وہ روحانیت کے راستے پر دور تک سفر کر سکتا ہے۔ ایک اچھا اور سچا انسان بن سکتا ہے۔

ہم مہاتما گوتم بدھ، زردشت اور کنفیوشس جیسے فلسفیوں کو اگر ذہن میں رکھیں اور ان کی طرح

زندگی کے مقصد کو پانے کی کوشش کریں تو اخلاقی حیثیت سے اور انسانی قدروں کے ساتھ ہم اپنے سے اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بہتر سلوک کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں صوفی تحریک اپنے اخلاقی اور روحانی فلسفے کے ساتھ اسی تصورِ زندگی کو اپنانے والی تحریک ہے جسے ہندوؤں میں بھگتی آندولن کہا جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے کبیر کے اس دوہے کو سامنے رکھ سکتے ہیں ۔

کبیرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر

نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

صوفی دراصل ایک درویش صفت آدمی ہوتا ہے جو سچے دل سے سب کا دوست ہوتا ہے اور کسی سے بیر نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں نہ مذہبوں کی کوئی تفریق ہوتی ہے نہ وہ ملکوں، ملتوں اور قوموں کی غیر انسانی تقسیم کو جائز سمجھتا ہے۔ غالب کی طرح وہ رسموں کو ترک کرتا ہے اور ایک نقطے پر اس کی نظر جم جاتی ہے کہ وہی سچائی اور اچھائی کا مرکز کشش ہوتا ہے۔

صوفی خدا کو ایک مانتا ہے اور اس کے انیک روپ ہیں، جنھیں وہ جلوۂ صد رنگ سمجھتا ہے۔ جو دھنک کی طرح الگ الگ رنگ رکھتے ہیں مگر سب کا مرکز ایک ہی نقطۂ نور ہوتا ہے۔ خواجہ میر درد کا شعر ہے ۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا

ہم بھی مہماں تھے واں اک تو ہی صاحب خانہ تھا

یعنی سچائیاں اور اچھائیاں طرح طرح سے ہیں، رنگا رنگ ہیں مگر وہ نور ایک ہی ہے جس سے یہ سارے رنگا رنگ جلوے اور دائرے پیدا ہورہے ہیں۔ اسی نقطۂ نور تک پہنچنا اور کثرت میں وحدت کو دریافت کرنا ایک صوفی کا کام ہے۔ وہ وحدت پر یقین رکھتا ہے اور کثرت کو جلوہ آرائی مانتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شیش محل میں کوئی چراغ یا شمع جلا دی جائے۔ اب جتنے آئینے ہوں گے ان سب میں اس ایک روشن چراغ کا عکس پڑے گا اور ہر ایک میں ایک شمع جلتی ہوئی نظر آئے گی تو بات سمجھ سے پرے ہو جائے گی۔ جو اپنی جگہ سچ بھی ہوگی اور ایک طرح سے اسے فریبِ نظر بھی کہا جا سکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفیانہ طور پر یا ایک فکری نقطۂ خیال کے اعتبار سے غالب اسی صوفیانہ نقطۂ نظر

کے قائل ہیں۔ وہ تمام عالم کو حلقۂ دام خیال کہتے ہیں یعنی وہ خیال جو ریشم کے جال کی طرح ہمیں اپنے حلقے میں پھنسا لیتا ہے اور ہمیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ایک ایسے تصور کے دام میں گرفتار ہو گئے ہیں جس کو ہم پوری طرح نہ توڑ سکتے ہیں نہ جوڑ سکتے ہیں۔ اردو کے ایک شاعر کا شعر ہے ؎

نہ جانے میں آباد تھا کس جستجو میں
گلستاں نے لبھایا رنگ و بو میں

غالبؔ کا اپنا شعر جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالبؔ نے اپنے اس خیال کو جو فلسفۂ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر رہا ہے اپنے متعدد اردو شعروں میں دہرایا ہے۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں ؎

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

پہلے شعر کا مطلب ہے کہ سمندر کا وجود اپنی جگہ پر ہے۔ ایک بسیط حقیقت کی طرف، ایک ناقابلِ انکار سچائی ہے۔ مگر ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ لہریں ہیں، دور تک پھیلی ہوئی سمندر کی سطح ہے۔ اس کے پانیوں کی نیلاہٹیں ہیں۔ اس کا جو صورت ہے اس کا زور و شور ہے مگر یہ ظاہری علامتیں ہیں، سمندر نہیں ہے۔ اسی لیے دوسرے مصرعے میں غالبؔ نے کہا ہے کہ یہاں قطرہ و موج اور حباب میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو ایک بے معنی بات ہے۔ یعنی وجود ایک ہے جو ناقابلِ انکار ہے۔

دوسرے شعر میں شاہد یعنی دیکھنے والا اور دیکھنے کا عمل اور جو دیکھا جا رہا ہو وہ سب ایک ہی ہیں۔ پھر مشاہدے کے لیے کوئی معنی نہیں رہ گئے۔

وحدت الوجود فلسفے کا ایک بڑا مسئلہ ہے اور تصوف کا بھی، خود مذہب کا بھی مگر سب سے زیادہ اس پر زور تصوف نے دیا ہے اور دوئی سے انکار کیا ہے۔ غالبؔ بھی اسی وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر

ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی اس عالم کو دیکھتا ہے، اس جہان رنگ و بو کی سیر کرتا ہے۔ اس کی طرف سے آنکھیں بند ہیں مگر اس کی حقیقت اور اس کے معنی کو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کی نفی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ غالبؔ کا ایک اور شعر بھی اسی معنی کو اپنے اندر سے پیش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم

کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

یعنی یہاں جو ہم رنگا رنگ، شکل بہ شکل، ہزار صورت جلوے دیکھتے ہیں وہ سب وہم و خیال کی پرچھائیاں ہیں۔ ان کو ہم مانتے ہیں مگر یہ وہم و گمان کی پرستش سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان خیالی بتوں نے مجھے کافر کر دیا۔ یہاں غالبؔ نے کفر کے معنی بھی سمجھا دیے کہ وہ ہی جلوے ہیں جو خیال، قیاس، گمان اور وہم کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان کو ماننا کفر ہے اور ان سے انکار کرنا اور حق پر جو واحد ہے، وحید ہے، احد ہے، ایمان رکھنا یقین و اعتقاد کی بہترین صورت ہے۔

اس طرح کے شعر غالبؔ کے یہاں بہت مل جائیں گے۔ وہ اس تصور وحدت پر جسے وحدت الوجود کہنا چاہیے، یقین رکھتے تھے مگر اس کے دوسرے پہلو یعنی وحدت الشہود کو بھی مانتے تھے۔ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائنات ایک وحدت ہے۔ وجود واحد ہے اور یہ وجود ذات واحد کا آئینہ ہے جسے ہم واجب الوجود کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وحدت الشہود کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہم جو کچھ اپنے احساس اور ادراک کے وسیلے سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہیں ہاں یہ ماننا شرط ہے کہ وہ اس ایک وجود کا جلوہ

صد رنگ ہے۔ ان کا اردو غزل میں ایک قطعہ ہے۔ بے حد اہم اور خیال انگیز قطعہ۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کو مانتے ہوئے بھی وحدت الشہود سے انکار نہیں کرتے کہ یہ مادی دنیا بھی ان کے لیے ایک حقیقت ہے اور غالب جیسا ذہین انسان اور مادی حقیقتوں سے محبت کرنے والا شخص اس سے انکار بھی کیسے کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اپنے طور پر ایک حسین و جمیل شے ہے اور اس میں انسانی حسن ایک عجیب دل کشی اور سحر جیسی کیفیت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔

دنیا کی ہر شے خوب صورت ہے، دل کش ہے۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ہم ان چیزوں سے دل لگائیں، ان کا احترام کریں، ان کو دیکھ کر اور ان کو پا کر خوش ہوں لیکن یہیں سے غلط خواہشیں بھی جنم لیتی ہیں۔ غیر ضروری خوشیاں بھی انسانی دل اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس میں خود غرضی، خود پسندی، خام طمعی اور لالچ بڑھ جاتا ہے۔ نفس کشی کی جاتی ہے اور زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزارا جاتا ہے۔

غالب کے یہاں عملی تصوف نہیں ہے۔ یعنی وہ عبادات اور ریاضت سے بھی گہری دل چسپی نہیں رکھتے، کبھی کبھی کر لیتے ہیں اور کبھی یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

وہ اس بات سے بھی پریشان ہوتے ہیں جس کا ذکر اس شعر میں آیا ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور اسی غزل کا یہ شعر بھی ہے ۔

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جہاں تک تصوف کے فلسفیانہ مسائل کا تعلق ہے وہ ان پر برابر سوچتے رہے ہیں اور مطالعہ بھی کرتے رہے ہیں۔ جب وہ اپنی جوان العمری میں پنشن کے قضیے کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے تو اس زمانے میں رسالۂ تصوف بھی ان کے مطالعے میں رہا تھا جیسا کہ ان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں صوفیانہ خیالات ابر پاروں کی طرح ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور فلسفے سے دل چسپی رکھنے والے اس کو صوفیانہ تصورات کی صورت میں دیکھنا پسند کرتے تھے کہ اس سے زندگی اپنے عمل اور نتائج عمل کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔

مزارات اولیا پر غالبؔ چاہے نہ جاتے ہوں لیکن انھوں نے ایک مثنوی میں یہ لکھا ہے کہ جیسے اللہ سے مدد مانگتا ہے ایسے ہی رسول سے یا خدا کے ان نیک بندوں سے جو خاصان خدا میں سے تھے، امداد طلب کرنا غلط بات نہیں ہو سکتی۔ اس سے ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ ان روحانی رشتوں کے بھی قائل تھے جو تصوف کے ذریعے عالم امکان سے پیدا ہوتے ہیں اور جس میں مادی، غیر مادی زندگی، ذہن اور زمانے سے رشتہ رکھنے والی چیزیں ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتی ہیں یا اوٹ رشتہ پیدا کر لیتی ہیں۔ ان کا یہ مصرعہ ۔

کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

دونوں عالموں سے مراد ہے دنیا اور آخرت، مادی اور روحانی حقائق۔ وہ بھی جو ہماری نظر کے سامنے ہیں اور وہ بھی جو ہماری آنکھوں سے غائب ہیں اور دل کی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

غالبؔ، انسان کو بڑا وجود دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا مقام فرشتوں سے بھی بلند ہے اور اس لیے ہے کہ وہ بیک وقت مادی سچائیوں سے قریب بھی ہے اور روحانی حقیقتوں سے بھی۔ ان کا یہ شعر ۔

وہی اک بات یاں موج نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اس کی طرف ایک معنی خیز اشارہ ہے کہ چمن اس عالم رنگ و بو کا ایک عجیب مرقع ہے کہ جس میں رنگ بھی بکھرتے ہیں اور خوشبوئیں بھی اور انسان کی نظر کا تعلق رنگوں سے ہے اور دل و دماغ کا رشتہ ان خوشبوؤں سے نہ جن کو دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مادی حقیقت اپنے طور پر روحانی حقیقت بھی ہے اور روحانی سچائیاں مادی مظاہر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں اور جب یہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو پھر زندگی، زمان اور زمین بہت سی قیدوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور وہ کیفیت ہوتی ہے۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

غالب کے یہ شعر بھی ان کی صوفیانہ طریقۂ ذکر و فکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

انسان وجود مطلق ہی کا حصہ ہے اس لیے کہ یہاں اس کے ماسوا کوئی چیز موجود ہے ہی نہیں اور یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے قطرے کا وجود سمندر سے الگ نہیں اور سمندر سے قطرہ مل جاتا ہے تو اسی کا پھر حصہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعر کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

جس طرح دنیاوی معشوق کی کمر بہت ہی باریک ہوتی ہے، ریشم کے دھاگے جیسی اسی طرح معشوق مطلق کی کمر یہ عالم ہے یعنی مادی دنیا وہاں بھی کمر معدوم ہوتی ہے اور یہاں بھی۔ سچ پوچھیے تو اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ یعنی یہ دنیا بھی ہے اور نہیں بھی۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

یعنی دُنیا کی ہزاروں ہزار تکلیفیں اسی وقت تک ستاتی ہیں جب تک کہ آدمی عشقِ حقیقی کو نہیں اختیار کرتا۔ جب وہ عشق کے لااُبالی اور لاعلاج دُکھ کو اپنا لیتا ہے تو پھر دُنیا کا کوئی دُکھ اسے تکلیف نہیں دیتا۔ عشق کا یہ تصور تصوف کی دین ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کے ذہن پر تصوف کا گہرا اثر تھا۔ وہ اس کے مسائل پر بھی سوچتے تھے اور اپنے شاعرانہ رنگ میں اسے پیش کرتے تھے۔ ان کے دیوان کی سیر کے وقت ایسے بہت سے شعروں پر نظر جاتی ہے جن میں وہ مسائل تصوف کی گرہ کشائی کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی کہا ہے ۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اکائی: ۱۵

غالبؔ بہ حیثیت قصیدہ گو شاعر

غالبؔ اپنے زمانے کے بہت اچھے سخنوروں میں شمار ہوتے تھے اور خود کو بھی وہ اعلیٰ درجے کا شاعر سمجھتے تھے اور شاعرانہ تعلی کے طور پر اپنے اشعار میں اس کی طرف اشارے کرتے تھے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

اس زمانے میں شاعر کے لیے ایک استاد کے درجے پر پہنچنا بڑی بات ہوتی تھی اور اس کے لیے قصیدہ کہنا ایک معیار قرار دیا جاتا تھا اور جو شاعر قصیدہ نہیں کہہ سکتا تھا وہ استاد خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ حالیؔ نے اس کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے اور غالبؔ تو خود ہی کہا کرتے تھے کہ لوگ میری غزلوں کی تعریف کرتے ہیں، میرے فارسی قصیدوں کو نہیں دیکھتے جن میں، میں نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔

غالبؔ نے فارسی میں بہت قصیدے لکھے۔ ان میں حمد، نعت اور منقبت میں بھی ان کے بہت اعلیٰ درجے کے قصیدوں کی تعداد ۱۲ (بارہ) ہے۔ اگر دو اردو قصیدے اس میں شامل کر لیے جائیں تو تعداد ۱۴ ہو جاتی ہے جو چہاردہ معصومین کی تعداد کے عین مطابق ہوتی ہے۔ یہ چودہ معصومین شیعہ عقیدے کے مطابق ۱۲، امام ہیں اور حضرت فاطمہ نیز رسول مقبول ہیں۔ ان سب کو معصوم خیال کیا جاتا ہے۔

غالبؔ نے اردو میں قصیدے نسبتاً بہت کم لکھے ہیں یعنی چار۔ ان کے قصائد کی بڑی تعداد فارسی میں ہے۔ اردو میں دو قصیدے حضرت علی کی شان میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ہیں۔ بہادر شاہ ظفر دہلی کے آخری بادشاہ تھے۔ ان کا دربار اس لیے قابل احترام تھا کہ وہ شاہجہاں اور عالمگیر جیسے بادشاہوں کی یادگار تھے۔ شاہجہاں نے تو شہر شاہجہاں آباد بنایا تھا۔ لال قلعہ، دہلی کی شاہی مسجد اور مسجد فتح پوری اس کی یادگار ہیں۔ لال قلعے کا دیوان خاص بہت ہی خوب صورت عمارت ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے۔

اگر فردوس بروئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یعنی اگر دنیا میں کہیں فردوس بریں موجود ہے تو وہ یہی عمارت ہے، فقط یہی اور محض یہی تعمیر ہے۔

یہیں تخت طاؤس بچھا رہتا تھا جس پر بادشاہ جلوہ افروز ہوتا تھا اور کوہ نور ہیرا اس کے تاج میں جگمگاتا رہتا تھا۔ اب وہ تخت طاؤس تو نہیں تھا، کوہ نور ہیرا بھی نہیں، دولت و ثروت بھی نہیں مگر شہنشاہ کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں بادشاہ کو محبت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ غالبؔ نے بھی اسی روایت کا سہارا لے کے بہادر شاہ ظفر کی اپنے فارسی اور اردو قصیدوں میں تعریف کی ہے۔

حضرت علیؓ آنحضرت رسول مقبول کے داماد قریب ترین رشتے دار تھے اور شیعہ عقیدے کے مطابق امام اول تھے اور ان کے دو بیٹے امام حسن اور حسین بھی امام تھے اور پھر بارہ اماموں تک انھیں کی اولاد میں یہ سلسلہ چلا۔ اسی کو ماننے والے اثنا عشری کہلاتے ہیں۔

غالبؔ اپنے قصیدے میں بہت حد تک اثنا عشری تھے اور حضرت علی کو اپنا خداوند مانتے تھے۔ صوفیوں میں بھی حضرت علی سے عقیدت اور ارادت کا رشتہ مضبوط ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام صوفیانہ سلسلوں کے امیر اور بانی سلسلہ سمجھے جاتے ہیں۔ غالبؔ کے فارسی اور اردو قصیدوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت علی کے لیے لکھے جانے والے قصیدوں کی ہے۔ صرف بہادر شاہ ظفرؔ کے لیے تعداد میں قصیدے زیادہ ہیں۔

قصیدے کے لیے ایک خاص ہیئت اردو اور فارسی میں تقریباً متعین ہو گئی۔ قصیدہ بیشتر غزل کی فارم میں لکھا جاتا ہے۔ اس کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور اس کی اٹھان پر مطلع کی اپچ اور قصیدے کی خوب صورتی کا مدار ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مطلع آفتاب کے مطلع سے زیادہ خوب صورت ہے:

یار مطلع آفتاب است

اس کے بعد کے شعر تشبیب کہلاتے ہیں جن کا دوسرا نام نسیب بھی ہے۔ تشبیب کے معنی ہیں ذکر شباب۔ اس میں حسن و شباب سے متعلق بھی بیان ہو سکتا ہے اور بہار، برسات یا کسی دوسرے خوب صورت موسم کے دوران بھی اشعار رقم کیے جاتے ہیں۔ حکیمانہ اور فلسفیانہ طرز کی تشبیبیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ تاریخ و روایت سے وابستہ کوئی بھی مضمون یا ذاتی شخصی زندگی سے متعلق کوئی بھی موضوع تشبیب میں شامل ہو سکتا ہے۔

تشبیہوں کو ان کی خوب صورتی، ان کی ندرت، ان کے سحر دل کشی کے اعتبار سے قصیدے کی زینت سمجھا جاتا ہے اور اس میں شاعر اپنا بہترین زورِ طبع صرف کرتا ہے۔ اس کے بعد ایسا کوئی شعر آتا ہے جو تشبیب کے سلسلۂ اشعار کا رشتہ مدح اور ستائش سے جوڑ دیتا ہے۔ یہ شعر گو تعداد میں ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں قصیدے کے لیے گریز کہلاتے ہیں۔

گریز بہت نازک کڑی ہوتی ہے اور اس میں شاعری کی فن کاری کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے کہ وہ ایک سلسلے کو دوسرے سلسلے سے بہت خوب صورتی کے ساتھ ملا دے۔ اس کے بعد جو اشعار آتے ہیں وہ مدح و ستائش یا تعریف و تحسین سے متعلق ہوتے ہیں۔ قصیدہ لکھنے کا مقصد بھی تعریف و تحسین ہی ہوتا ہے۔ ہجو بھی کی جاتی ہے مگر قصیدے کے سلسلے میں وہ ممدوح کی نہیں، اس کے دشمن کی ہوتی ہے۔

مداح میں ہر طرح کے مضامین آتے ہیں جن میں ممدوح کے کردار کی خوبیاں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ انصاف کرتا ہے، اپنی دولت و حشمت میں وہ بہت بڑا درجہ رکھتا ہے، اس نے قلعے فتح کیے ہیں، روئے زمین پر اس کا رعب و داب پھیل گیا ہے، آسمان و زمین کے درمیان اس کی شخصیت چاند سورج کی طرح چمکتی ہے، اس کی سپاہ ستاروں کی طرح ان گنت ہے اور خاص طرح سے چمک دمک رکھتی ہے۔ بادشاہوں کی تعریف میں اس کے علاوہ ان کے قصر و ایوان، لال و جواہر، تلوار اور گھوڑے کی بھی خاص طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ گھوڑے اور تلوار کی وسطی عہد میں بڑی اہمیت تھی۔ گھوڑا action کی علامت تھا اور تلوار قوت کی۔

قصیدے کے اکثر مضامین روایتی ہوتے تھے۔ خاص طور پر اس عہد میں جب بادشاہتیں باقی نہیں رہی تھیں لیکن جو کچھ کیا جاتا تھا وہ قدیم بادشاہوں کی روایت اور حوالے ہی سے کیا جاتا تھا۔ اس میں امیر، جاگیردار اور بزرگانِ دین بھی آ جاتے تھے جن کی تعریف میں ان کی نیکی، بھلائی، خوفِ خدا اور اللہ کے بندوں پر ان کی رحمت اور شفقت کا خصوصی طور پر ذکر ہوتا تھا۔

غرض کہ قصیدے میں جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ ایک طرح کا آئیڈیل ہوتا تھا اور اس میں مبالغہ طرح طرح سے شامل رہتا تھا اور اس کو پسند کیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانے کی شعری روایت تھی اور اسی میں طرح طرح کی جدتیں، ندرتیں اور خوبیاں پیدا کی جاتی تھیں اور اسی پر شاعری کی اپنی بڑائی اور بہ حیثیت فن کار اس کی خوبیوں کا بھی

دارومدار ہوتا تھا۔

غزل میں معشوق کی تعریف ہوتی تھی اور نئے نئے انداز سے ہوتی تھی۔ اس سے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ذکر ہوتا تھا۔ اس کے ناز و انداز کی تعریف ہوتی تھی۔ عشوہ و ادا کا ذکر ہوتا تھا۔ قصیدے میں ممدوح کے جاہ و جلال اور حشمت و اقبال کی تعریف کی جاتی تھی اور اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا جاتا تھا۔ غالبؔ کے قصیدوں میں وہ اردو قصیدے ہوں یا فارسی یہی اجزائے ترکیبی ملتے ہیں اور انھیں کی خوب صورتی کو معیار قرار دیا جاتا ہے۔

قصیدوں کے علاوہ غالبؔ نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ وہ بھی تعریف ہیں اور ان میں بھی قصیدہ نگاری کی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ بیشتر وہ بغیر کسی تمہید کے ہوتے ہیں اور اسی نسبت سے ان میں گریز بھی نہیں ہوتی لیکن مدح نگاری کے بعد دعا اور مدح نگاری شامل رہتی ہے۔ یہ قطعات زیادہ تر فارسی میں ہیں۔

غالبؔ کے چار اردو قصیدوں میں دو قصیدے جو حضرت علیؓ کی تعریف میں ہیں، فلسفیانہ انداز رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ قصیدہ ۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس تصور کو لے کر یہ شعر لکھا گیا ہے کہ یہ تمام عالم جو ایک تماشا گاہ کی طرح ہزار جلوے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور نظر بہ نظر صدہا جلوے ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ایک طرح سے آئینے کا وجود رکھتا ہے اور معشوق کی یکتائی کو پیش کرتا ہے۔ تصوف میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جان و جہاں آئینۂ جمال الٰہی ہیں۔ یہیں سے غالبؔ نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ اگر خدا جو ایک معشوق یکتائی کی طرح ہے خود نظر اور خود بیں نہ ہوتا تو پھر ہم نہ ہوتے۔ اس لیے کہ آئینے میں تو جو بھی عکس ہوتا ہے وہ دیکھنے والے کا ہوتا ہے۔

اسی میں ایک اور عجیب و غریب شعر آیا ہے اور غالبؔ کی فلسفیانہ اور بڑی حد تک صوفیانہ فکر کی نمائندگی کرتا ہے ۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

یہاں کوئی عقل و حکمت کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی عبادت و ریاضت پر ناز کرتا ہے تو وہ بھی ایک بے معنی بات ہے۔ دین اور دنیا دونوں ایک اعتباری صورت ہیں اور گویا ہماری فکری نارسائیوں کا نتیجہ ہیں جس کو غالب درد یک ساغر غفلت کہتا ہے۔ یعنی اس پیالے کی تلچھٹ جس میں غفلت کی شراب بھری ہوئی ہے۔ فلسفہ و تصوف کے انتہائی مرحلوں ہی میں اس طرح سوچا جا سکتا ہے کہ دین و دنیا دونوں ایک طرح سے اُلجھاوے ہیں۔ ان سے اوپر اٹھ کر سوچنا چاہئے۔ فارسی کا مصرعہ ہے۔

آستیں بر دو عالم افشاں نم

میں دونوں عالموں پر اپنی آستین جھاڑ دیتا ہوں یعنی دونوں سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔

اس طرح کے اشعار اپنی تشبیب میں پیش کر کے غالبؔ اس قصیدے میں آگے بڑھتے ہیں۔ تو یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ میں خدا کی پناہ کس قدر بہرزہ سرائی پر آمادہ ہوں اور گریز کا شعر لکھتے ہیں۔

نقش "لاحول" لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!
یا علی عرض کر اے فطرت و سواس قریں!

اس میں جو منقبت علی کے لیے شعر آئے ہیں۔

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر
نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوح خدا؟
تیری تعلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

اے علی تمہارے پاک جسم کے لیے پیغمبر کا شانہ منبر کا کام دیتا ہے اور اے علی تمہارا نام نقش نگیں کی طرح عرش کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔ اس میں حضرت علی کی تعریف بھی ہے اور ایسی تلمیحات بھی ہیں جن سے حضرت علی کے بلند مرتبے کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

اے علی تمہاری تعریف صرف خدا ہی سے ممکن ہے اور کون کر سکتا ہے۔ واجب سے مراد یہاں واجب الوجود ہے جو خدا کی ذات کے لیے آنے والا کلمہ ہے اور فلسفیانہ اصطلاح ہے اس لیے شیخ کا شعار اور اس کی دستورِ حیات کو اپنی روشنی سے پیش کر سکتا ہے۔

اس قصیدے میں جو فکریں، نئے خیالات اور گہرے انسانی تجربے آئے ہیں ان کو ہم اس شعر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اس کے خاتمے میں یہ دو شعر بھی آئے ہیں۔

جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

دوسرا قصیدہ بھی جو دیوان میں پہلا قصیدہ ہے اس فکر انگیز مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ، سویدائے بہار

اس مطلع کے معنی بھی فلسفیانہ ہیں۔ فکر و خیال سے آراستہ ہیں کہ اس چمن میں دنیا کا کوئی ذرہ بھی بیکار نہیں اور اسی لیے فیض و فیضان کی وجہ سے وہ ایک خوشنما ساز کی طرح نغموں سے پُر ہے، بھیدوں سے بھرا ہے اور اپنے حسن و جمال کے باعث بے حد پُر لطف اور پُر کشش ہے۔ یہاں تک کہ لالے کے پھولوں کا سایہ بہار کے دل کا ایک نشان مکمل ہے۔ یعنی یہاں جو شے ہے وہ ایک نئے مرقع اور دل آویز تصویر سے سجا ہوگا۔ ایک حکیم، ایک فلسفی اور ایک دانش سود مند رکھنے والے کی نظر اسی طرح کام کرتی ہے کہ وہ بقول اقبال سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کرتا ہے۔ تشبیب کے زیادہ تر اشعار اسی حکیمانہ طرزِ فکر کا اظہار کرتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر
سبزہ مثل خط نو خیز ہو خط پر کار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطی سبزہ کوہسار نے پیدا منقار

ان دو شعروں میں دوسرا شعر گریز کا شعر ہے کہ اس کے بعد مدح کے اشعار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس قصیدے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں مدح نگاری کے لیے جو شعر آئے ہیں ان میں مطلع ثانی بھی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلزار

بادشاہ کی تعریف میں آنے والا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پے تعمیر سرا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار

قصیدوں کی زبان مشکل ہے۔ طرز اظہار میں پیچیدگی ہے اور تشبیہات و استعارات میں ندرت اور طرفگی اس کے ساتھ وہ بلند آہنگی جو قصیدہ نگاری کی بڑی خصوصیات میں داخل ہے۔

اردو قصیدوں میں ایک قصیدہ اپنی تشبیہات کے اعتبار سے بالکل نیا اور فکر و خیال کی ندرتوں سے بھرا ہے۔ یہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

ہاں مہہ نو! سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس میں ماہ نو کا جو انداز نظر ہے اور جس طرح وہ عالم خیال میں اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہے وہ اس قصیدے میں ایک نیا پن پیدا کرتا ہے۔ اسی میں یہ خوب صورت شعر آتا ہے۔

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

گریز کا انداز ان شعروں میں سامنے آتا ہے۔

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام ؟
(چرخ غور)

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہ انام
(بہت سے آرزی)

یہ قصیدہ عیدالفطر کے موقع پر پیش کیا گیا ہے اور اس میں غالبؔ نے بادشاہ کے انعام و اکرام کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس قصیدے میں غزل بھی آئی ہے۔ یہ روایت بھی فارسی اور اردو کے بعض قصیدہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے اور غالبؔ نے اسے بڑی خوب صورتی اور حسن کاری کے ساتھ نبھایا ہے۔ آخر کے شعر یہ ہیں۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام
تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی ہے دستور صورت ارقام

آتش و آب و باد و خاک چار عنصر ہیں۔ غالبؔ نے پہلے مصرعے میں ان کو پیش کیا اور دوسرے مصرعے میں ان کی صفات کو یہ انحصار نگاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے اور صنعت ترصیع، صنعت تضاد اور صنعت لف و نشر کا ایک مثال جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو زبان پر کتنی قدرت تھی۔

غالب کا چوتھا قصیدہ اس شاندار مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

صبح دم دروازہ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مطلع مطلع آفتاب کی طرح روشن ہے۔ اس کے تحت آنے والے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانب مشرق نظر
اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

اس کے بعد گریز اور تعریف کے یہ تین شعر ملاحظہ ہوں۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاج زریں مہر تاباں سے سوا
خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

ان اشعار کے لب ولہجے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے یہاں اردو قصیدہ نگاری کا ایک نیا معیار قائم ہوتا ہے جو طویل انداز سے مختلف ہے مگر ادبی دلچسپیوں کے اعتبار سے اسے ہم اپنی بہترین قدر میں ایک نیا درجہ دے سکتے ہیں۔

اس قصیدے میں آنے والی غزل کے دو شعر یہ ہیں:

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

اکائی: ۱۹

غالبؔ کا تصورِ حسن و عشق

غالبؔ کے ادبی شعور، تخلیقی حسیت اور عاشقانہ شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے تصورِ حسن و عشق پر غور کرنا ضروری ہے کہ شاعر یا فن کار اپنے محبوب یا محبوب شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس کے پس منظر میں اس کا Concept of beauty اور Concept of love موجود رہتا ہے۔ دنیا کی ہر شاعری بلکہ فنونِ لطیفہ میں ہر فن کے ساتھ حسن و عشق کا تصور موجود رہتا ہے۔

حسن نیچر میں بھی ہوتا ہے اور مناظر میں بھی۔ پھل پھول، برگ و بار، صبح و شام، ستارے مختلف قوموں، نسلوں، علاقوں اور انسانوں کا تصورِ حسن اجتماعی بھی ہوتا ہے اور انفرادی بھی۔ آدمی کا اپنا مزاج بھی اس میں کام کرتا ہے اور معیار بھی۔ اس معیار کو پیدا کرنے میں اس کا علم، اس کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی شریک رہتے ہیں۔ اس نے کیا کیا دیکھا، کس طرح دیکھا، کب کب دیکھا۔

علاوہ بریں اس ماحول کا جغرافیہ کیا ہے۔ وہ جنگلوں سے گھرا ہوا ہے یا دشت و کہسار سے۔ دریا، ندی، چشمے اور سمندر اس کو خوب صورت اور پُرکشش بنانے میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تصورِ حسن کو پیدا کرتی ہیں اور اسی سے تصورِ عشق جنم لیتا ہے۔

ہم عام طور پر عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی میں عشق کو بانٹ دیتے ہیں۔ یعنی خدا سے عشق اور بندے سے عشق۔ مگر معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں۔ خدا سے عشق بھی بندوں سے عشق ہوتا ہے اور انسانوں سے لگاؤ بھی خدا سے عشق ہی کی ایک صورت ہے اسی لیے عام طور پر عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیا جاتا ہے۔ عشق کی ایک تعریف تو وہ ہے جو اسے فلسفے سے قریب لے آتی ہے اور ایک تعریف وہ ہے جو اسے جنس اور جذبے سے متعلق کرتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ دونوں عشق ہیں۔ اساساً تعلق و نفسیاتی رشتہ ہے جو ایک ذات کو ایک سے زیادہ ذوقِ نگہ رکھنے اور سوچنے کا دوسرا نام ہے۔ میرؔ نے اپنی ایک مثنوی میں عشق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

عشق اہل جناب رکھتا ہے

جبرائیل و کتاب رکھتا ہے

ان ہی کا ایک شعر ہے ۔

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو

سارے عالم پہ چھا رہا ہے عشق

غالب نے بھی عشق کے تصور کو لیا ہے مگر سر تا سر صوفیانہ اور روحانی عشق ہی ان کے یہاں نہیں ہے۔ وہ ارضی اور مادی عشق کو بھی پسند کرتے ہیں اور یہ کہتے نظر آتے ہیں ۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

انھیں کا دوسرا شعر ہے ۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں شعروں میں مادی اور مجازی عشق بھی اپنی متحرک پرچھائیاں ڈال رہا ہے اور صوفیانہ عشق کی طرف بھی ذہن منتقل ہو رہا ہے۔ تصوف سے ان کو جو لگاؤ تھا اور جس طرح وہ اپنی شاعری میں اور اپنے ادبی شعور کے ساتھ جگہ جگہ صوفیانہ مسائل کو لاتے تھے اس کے نتیجے میں یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ عشق کے بیان میں مادی اور ارضی عشق کی کشش سے بے نیاز ہو جاتے۔ آخر تو یہ مادے سے آراستہ اور حسین شکلوں سے پیراستہ زندگی بھلی لگتی تھی۔ وہ اس سے انکار کو جائز خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کی حسن پرستی کو ہم ان کے مختلف شعروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ۔

تو اور آرائش خم کاکل

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

یہاں آرائش خم کاکل ، زلفوں کو سنوارنا اور گویا بال بال موتی پرونا ہے جو مادی عشق کے

پرستاروں کو بہت اچھا لگتا ہے۔ اب اندیشہ ہائے دور دراز یہ کہ جب وہ اس طرح بَن سنور کر سامنے آئیں گے تو دل پر کیا قیامت گزرے گی۔ وہ تو اپنے محبوب کو خدا کو بھی نہیں سونپنا چاہتے۔

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

یہاں خدا کو سونپنے کے معنی خدا حافظ کہنے کے ہیں۔ غالبؔ نے اپنے عشقیہ اشعار میں طرح طرح سے دل آویزیاں اور پہلوداریاں پیدا کی ہیں۔ ان کا اردو مصرعہ ہے۔

کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

زلفِ خم بہ خم کی یہ کیفیت ان کے مختلف شعروں میں ملتی ہے۔ یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے اور امرد پرستانہ اندازِ نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

یعنی تیرے خوب صورت چہرے پر سبزۂ خط آ جانے کے بعد بھی تیری زلفوں کے خم، ان کی جادو بھری کشش اسی طرح رہی۔ زہر مہرہ سانپوں کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے لیکن یہ علاج بھی تیری سانپوں جیسی کالی زلفوں کے مقابلے میں ناکام ہوا۔ افعی کالے سانپ کو کہتے ہیں۔ زمرد ایک طرح کا قیمتی پتھر ہوتا ہے جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ اسی لیے سبزۂ خط کو زمرد کہا ہے۔ یہ شعر غالبؔ کی پیکر تراشی کا ایک اچھا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے مگر اس میں اندیشہ ہائے دور دراز بھی شامل ہے۔

غالبؔ کے یہاں عشقیہ شاعری میں اس طرح کے شعر بھی ملتے ہیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اس شعر میں جو ایک خوب صورت مطلع کی شکل میں ہے غالبؔ کے یہاں محبوب کی زلفوں کا جو تصور ہے وہ اپنی خوب صورت پرچھائیاں یہاں بھی ڈالتا ہے اور زلفوں کو سنوارنے کے لیے چوٹی کھول دینا اور شانوں پر بالوں کو بکھیر دینا محبوبوں کی عام ادا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالبؔ نے کہا ہے کہ اتنے تم اپنی

زلفوں کو کھول کر آرائش گیسو میں دل جمعی لیتے رہو گے، اتنا وقت یہاں بیت جائے گا کہ ہم باقی بھی نہ رہیں گے۔
اسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہم نے مانا کہ ہمارا حال خراب سن کر تم اثر لو گے لیکن راستے میں تمہیں خبر ہوگی راستے تو ہم خاک ہو چکے ہوں گے۔ غالب کے شعروں میں اس طرح کے عشقیہ شعر بھی ملتے ہیں۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

یعنی میرا دل بے اختیار چاہ رہا ہے کہ محبوب کا خط آتا، وہ مجھے یاد کرتا اور میں دل فریبی عنوان پر اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ اسی غزل کا یہ شعر بھی عشقیہ تصورات کو ظاہر کر رہا ہے۔

ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

حسین چہرے پر سیاہ زلفوں کا بکھرانا شعراء کے نزدیک حسنِ محبوب کی بے حد دل آویز تصویر ہے اور غالب کو تو گیسوئے محبوب سے یا پھر زلفِ خم بہ خم کے حسین تصور سے غیر معمولی عشق ہے۔ اور یہ شعر تو ان کا بے حد حسین شعر ہے۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

غالب نے اپنے اردو اشعار میں محبوب کی جو حسین اور بے حد دلکش تصویریں پیش کی ہیں، ان میں ان کا یہ مرقع بہت ہی خوب صورت اور معنی آفریں ہے۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالبؔ کے قاموسِ خیال کی یہ وہ حسین تصویریں ہیں، اس میں مغل دور کی عیش و عشرت کا ماحول بھی ہے۔ ساز و طرب کی محفلیں بھی ہیں، رقص و سرود کی دل کش تصویریں بھی ہیں اور معشوق کا وہ تصور بھی جو غالبؔ کے یہاں اور غالبؔ کے دور میں ایرانی اور اس سے کچھ زیادہ ہندوستانی اثرات کے ساتھ اردو شاعری میں موجود تھا۔ غالبؔ جس دور میں پیدا ہوئے تھے وہ ذہنی تبدیلیوں کا دور تھا۔ جاگیرداری نظام ان علاقوں سے سمٹ رہا تھا جن میں غالبؔ زندہ تھے اور جن کی تہذیبی فضا میں ان کا ذہن سانس لے رہا تھا لیکن وہ اپنی تہذیبی نفسیات کے تحت ایران سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے اور جاگیردارانہ معاشرے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے حال اور خیال میں اس کو جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ساقی کا جو کردار انھوں نے پیش کیا ہے وہ صرف ساقی کا کردار نہیں ہے ان کی معشوقۂ دل آزار کا کردار بھی ہے جس کو دشمنِ ایمان و آگہی کہتے ہیں اور مطرب کو جو مطربۂ دل نواز ہے، رہزنِ تمکین و ہوش قرار دیتا ہے۔

دیکھا جائے تو تمکین و ہوش کی ترکیب بہت اہم ترکیب ہے کہ ایک طرف تہذیب کی تمکنت اور ناز و غرور ہے اور ناز و غمزہ کا اضافہ ہے تو جاگیر داری دور کا تہذیبی اور تاریخی کردار نظر میں ابھر جائے گا۔ اسی کے ساتھ ہوش مندی کا لفظ بھی جڑا ہوا ہے۔ یعنی نئے حالات اور نئے خیالات پر نظر داری اور خبر داری کا رویہ جو دانش مند خاں جیسے مغل امراء میں تھا اور فرانسیسی سیاح برنیئر نے اس کی بہت تعریف کی تھی اور ایک حسینہ کا وہ جلوۂ نگاہ جو ان سب بچاریوں کو ایک لمحہ میں غارت کر دے۔ اور یہی غالب کے عہد کا عاشقانہ رویہ اور حسن پرستانہ نظریہ تھا۔ اسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمیں ان اشعار میں ملتی ہے اور جلوۂ نگاہ اور فردوسِ گوش جیسی لفظی ترکیبیں بھی جو غالب کی طرف سے اردو شعر و ادب کے لیے ایک "دین" کا درجہ رکھتی ہیں۔

غالب کو فارسی ترکیبوں سے خاص شغف تھا اور وہ اردو شاعری کی ابتدا ہی سے ان چیزوں کی طرف مائل تھے اور اپنے اردو شعروں میں ایسی ایسی ترکیبیں لاتے تھے جو ریختہ شاعری کو فارسی کے لیے بھی قابلِ رشک بنا دے۔ ہر موقع پر ایسا ہوا یا نہیں ہوا، یہ ایک الگ بات ہے لیکن جہاں تک ان شعروں کا تعلق ہے اور ان کے پس منظر میں دھنک کے رنگوں کی طرح جھلکتا ہوا تہذیبی ماحول ہے وہ اس خوب صورت قطعہ کے ایک ایک لفظی مرقع میں موجود ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس قطعہ کے آغاز اور خاتمے پر جو شعر آئے ہیں وہ اس افسردگی کو ظاہر کرتے ہیں جو مغل حکومت کے دورِ زوال پر سوچنے اور سمجھنے والے ذہنوں پر طاری تھی اور جس کے ساتھ "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کو خطاب کیا گیا ہے جو نا و نوش کی ہوس لے کر اس محفل میں آئے ہیں۔ وہ دورِ آخر کی اس محفل میں جس کے لیے غالب کے شاگرد مولانا حالی نے یہ شعر لکھا تھا۔

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

وہ رات جس کے گزرنے کا ذکر حالی نے کیا ہے اس کی صبح ایک اداس صبح کا ذکر غالب کے یہاں بھی ہے۔ اسی لیے زنار کا لفظ بھی آ رہا ہے اور ان لوگوں کو آگاہی بخش رہا ہے جو اس محفل کو جسے غالب نے بساطِ ہوائے دل کہا ہے اور بے حد خوب صورت ترکیب سے یاد کیا ہے، اس میں ہوائے دل آئی جاگیردارانہ فطرت،

امیرانہ مزاج اور عیش پرستانہ ماحول کی طرف ایک اشارہ ہے جو خود غالبؔ کے اپنے مزاج اور عاشقانہ تصورِ حیات کی نمائندگی کرتا ہے۔

دیدۂ عبرت نگاہ اس کے بعد کے شعروں میں کہا گیا ہے۔ جب کوئی بزم اجڑ جاتی ہے اور شمعِ محفل سے دھواں اٹھتا ہے، خوابوں کو شکست سے گزرنا ہوتا ہے اور خیالوں کی بازگشت شروع ہو جاتی ہے تو یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو آدمی اسے دیکھتا ہے وہ حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور یہی جذبہ، احساس اور خیال سوچنے والے ذہنوں اور محسوس کرنے والے افراد کو عبرت کی طرف لے جاتا ہے کہ ان کی نگاہوں میں عروج و زوال کی روشن و تاریک پرچھائیاں ایک تاریخی روایت بن کر سامنے آ جاتی ہیں۔ غالبؔ بھی اسی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

مغل دربار سے ان کا تعلق تھا۔ رنگا رنگ بزم آرائیوں اور سجی ہوئی محفلوں کا تصور ان کی نگاہوں میں بھی بسا ہوا تھا۔ حال میں نہیں تو خیال میں ان حقیقتوں کو دیکھتے رہتے تھے، ان کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور جب کچھ لکھنے اور کہنے بیٹھتے تو ادھر سے ادھر تک بکھری ہوئی تاریخ کی جھلکیاں ان کی نظر میں آ گئیں اور انھوں نے جو کچھ پیش کیا وہ ان کے ذہنی مرقع ہیں۔ ان کے اپنے حسن و عشق کی داستانوں کا ایک انداز ہے۔

غالبؔ کی عشقیہ شاعری کو ہم اس اندازِ نظر کے پس منظر میں شاید زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی پسندیدہ خواتین میں جن کو معشوقوں کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا اور غلط نہیں کہا جاتا کہ طوائفیں بھی تھیں اور طوائفوں سے تعلق اس زمانے کے اور امراء کا بھی ہوتا تھا اور اس زمانے تک بلکہ اس کے بعد تک عشقیہ شاعری کا یہی رنگ ملتا ہے۔

افسردگی جس کا ذکر اوپر آیا وہ اس قطعے کے آخری شعر میں بھی بہت ہی پُر تاثر انداز میں شامل ہے۔

صبح دم دیکھا تو وہ کیفیت تھی "نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے"

آخر کا شعر تو داغِ فراق اور صحبتِ شب جیسی ترکیبوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے اس شعر کے اثر و تاثیر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ عشقیہ شاعری میں درد و داغ، سوز و ساز، داغِ فراق اور صحبتِ شب ایسے الفاظ آتے رہے ہیں، جو کیفیاتِ عشق کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے اثر کی گہرائیوں کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حسن و عشق کا تصور اردو شاعری اور خود غالب کی شاعری میں اپنے معنی اور معنویت کے لحاظ سے مختلف فکر اور فن کے دائروں میں تقسیم ہے۔ ایسا شعوری طور پر بھی ہوا ہے، غیر شعوری طور پر بھی اور نیم شعوری طور پر بھی۔ آدمی کی اپنی جو خوشیاں، خواہشیں، خیالات، کامیابیاں اور ناکامیاں تھیں اور ہیں، ہمیشہ رہی ہیں، وہ اس کی زندگی، اس کے ذہن کو ہر دور میں متاثر کرتی رہیں اور یہ تاثر (Impression) اس نے اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے حالات کے مطابق قبول کیا اور اپنی صلاحیت کے دائرے میں رہتے ہوئے اسے پیش کیا اور طرح طرح کے تصورات اور ان سے وابستہ تصویریں اس کے ذہن کی سطح پر ابھرتی رہیں اور انھیں وہ اپنے الفاظ میں، اپنے محاورے میں اور اپنے استعاروں میں، اپنی تمثیلوں میں پیش کرتا رہا۔

زمانے کے ساتھ آدمی کے خیال بھی بدلتے ہیں۔ اس کے سوال بھی، کہنے کا طریقہ، سلیقہ بھی اور وہ یہ فیصلہ کرتا رہتا ہے کہ وہ کیا کہے، کیوں کہے؟ اور کیسے کہے؟ ہر آدمی یکساں صلاحیت نہیں رکھتا اور ہر لمحہ اس پر یکساں گزرتا بھی نہیں۔ کبھی وہ کسی جذبے کے تحت ہوتا ہے، کبھی کسی خیال کے زیر اثر، کبھی کسی تجربے میں گھرا رہتا ہے اور کبھی جستجو اسے اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ اس سے اس کا شعور بھی متاثر ہوتا ہے اور اس کے فن پر ان لمحوں کی پرچھائیاں بھی پڑتی ہیں اور گزرتی رہتی ہیں۔ غالب کے یہاں بھی معاملات حسن و عشق پر اس اعتبار سے بیان، حسن بیان اور لطف بیان کی مختلف سطحیں ملتی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اب اس میں شوخیٔ بیان بھی ہے اور دل میں چھپی ہوئی کچھ خواہشیں بھی۔ کچھ اور ایسی خوشیاں بھی ہیں جن کو انھوں نے کھلے ڈھلے انداز میں بیان نہیں کیا، اشاروں کنایوں میں بات کہہ دی۔ اسی طرح ان کا یہ شعر ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یعنی تم میرے سامنے اس طرح آئے ہو جیسے بجلی کوند جائے اور پھر ایک لمحہ میں آنکھوں سے غائب بھی ہو جائے۔

اسی طرح انھوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی معشوقہ کے قریب نہ آنے پر خوب صورت گلہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ برق کی بشری اور شباب کی طرح بے قرار نظر آتا ہے۔ اب یہ کس سے پوچھوں کہ آخر وہ کیا ہے، کس طرح ہے اور کس کے لیے ہے۔

ہر شخص کی اپنی ایک پسند ہوتی ہے اور وہی اس کے تصورِ حسن و عشق پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ غالب کے یہاں شوخی، شرارت اور اشارت اس کی محبوبہ یا محبوب کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔

ہے بس کہ ہر ایک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اکائی: ۱۸

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

ایک مختصر سوانحی خاکہ

غالبؔ (مرزا اسد اللہ خاں بیگ) مرزا عبداللہ خاں بیگ کے بیٹے تھے۔ غالبؔ کے اپنے بیان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دادا کا نام مرزا قوقان بیگ تھا۔ مرزا قوقان بیگ ماوراءالنہر کے علاقے سے جو مرکزی ایشیا میں واقع ہے ترکِ وطن کر کے شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ابتدا میں بعض دوسرے امیروں کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوئے آخر شاہ عالم کے دربار تک پہنچے اور جیسا کہ مرزا غالبؔ نے خود بیان کیا ہے۔ اگرچہ سلطنت میں ضعف آ چکا تھا اور ملک کے طول و عرض میں ایک طرح سے انتشار پھیلا ہوا تھا جب بھی بادشاہ عالم پناہ نے مرکزی ایشیا سے آنے والے اس سپاہی زادے کی قدر کی۔ اس کو پچاس سواروں کے ایک دستے کا سربراہ بنایا اور علم و نقارہ و نیز تنخواہ دے ممتاز کیا۔

مرزا قوقان بیگ شاہی خدمات سے کب تک وابستہ رہے اور انھوں نے اس اثنا میں کیا کیا کارنامے انجام دیے، اس کی کوئی تفصیل غالبؔ کے خطوں میں نہیں ملتی۔ بہر حال وہ اپنے وقت کے کوئی معزز اور محترم شہری رہے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے ایک بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی غلام حسین کمیدان کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ صاحب شہرِ اکبرآباد کے ایک معزز شہری تھے اور سرکار سہارن پور میں کسی فوجی عہدے پر فائز تھے۔ کمیدان کے معنی کمانڈنٹ کے ہیں۔ آگرے میں ان کی اچھی خاصی جائیداد بھی تھی۔

دوسرے بیٹے مرزا نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروزپور جھرکہ اور لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور میں ایک سپاہی پیشہ شخص کی حیثیت سے قسمت آزمائی کی۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ مہاراجہ الور کی فوج میں ملازم تھے جہاں راج گڑھ کے مقام پر کسی فوجی مقابلے کے نتیجے میں ان کو گولی لگی اور وہ وہیں پر ختم بھی ہو گئے۔ غالبؔ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک فارسی

قصیدے میں یہ شعر بھی لکھا ہے۔

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست
در خوا کے راج گڑھ پدرم را بود مزار

ترجمہ: مشاہدہ کافی ہے۔ اس میں کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ راج گڑھ کی خاک میں میرے باپ کا مزار موجود ہے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالب صرف چھ سال کے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف ان سے بھی عمر میں کم تھے۔ ایک اور چھوٹی بہن بھی تھی۔ مرزا عبداللہ بیگ کے ان خورد سال بچوں سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ جوان العمری میں ہی فوت ہوئے۔

غالب کی پیدائش ۱۷۹۷ء میں ہوئی تھی جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے والد کی وفات کا یہ سانحہ ۱۸۰۲ء سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان کی اور ان کے بھائی بہن کی سرپرستی ان کے ننھیال نے کی اور خاص طور پر ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کو اپنے زیر سایہ لے لیا۔ نصر اللہ بیگ خاں.........ا والد تھے اور پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے نائب قلعہ دار تھے۔ آگرے میں مرہٹوں کی شکست کے بعد ۱۸۰۳ء کے درمیان کا واقع ہے۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی کمان میں پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی افواج سے وابستہ ہو گئے اور پرگنہ پہاسو ان کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ مگر جلد ہی کسی فوجی نقل و حرکت کے دوران ہاتھی سے گر کر مرزا نصر اللہ بیگ خاں شدید طور سے زخمی ہوئے اور ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد لارڈ لیک بہادر نے ۱۸۰۶ء میں ان کے وارثوں کی پنشن مقرر کر دی۔ ان وارثوں میں غالب، ان کے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن شریک تھے۔ پنشن کی جو رقم اس وقت لارڈ لیک نے مقرر کی تھی بعد میں اس میں نواب احمد بخش خاں کے وسیلے سے کچھ تبدیلی ہوئی اور رقومات کی تقسیم نئے انداز سے عمل میں آئی۔ غالب کو زندگی بھر اس تقسیم سے اختلاف رہا۔

غالب کی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہیں تھی جب ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوگئی جو نواب الٰہی بخش خاں معروف، نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے اور بلی ماران دہلی میں اس وقت حویلی میں رہتے تھے جہاں آج کل رابعہ گرلز اسکول ہے۔ غالب دہلی میں دولہا بن کے آئے تو ان کو مرزا نوشہ خطاب دیا گیا جو بعد کے

لیے اُن کا عرف قرار پایا۔ وہ اکثر اپنے نام کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ اور حالی نے اُن کے مرثیہ میں یہ مصرعہ لکھا ہے ۔ ع

مرزا نوشہ تھا اور شہر یارات

شادی کے بعد مرزا غالب کچھ دنوں تک غالباً آگرے ہی میں رہے، بعد ازاں دہلی آگئے اور بلی ماراں میں سکونت اختیار کی۔ اُن کا آبائی پیشہ تو سپہ گری تھا مگر وہ اپنی زندگی میں صرف شعر و شاعری سے وابستہ رہے یا پھر ۱۸۵۰ء کے بعد ۱۸۵۷ء تک مغل دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ غالب کی بسر اوقات اس وظیفے کے تحت ہوتی تھی جو ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار انھیں سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے ملتا تھا اور ریاست لوہارو کے خزانہ سے ادائیگی عمل میں آتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا بھی امکان ہے نواب الٰہی بخش خاں معروف اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہوں۔ غالب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی زندگی تک وہ وظیفہ لیتے رہے جو انھیں سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے نواب احمد بخش خاں کی سرکار سے ملتا تھا لیکن اپنے اخراجات کی زیادتی اور قرض داری کی وجہ سے پریشان ہو گئے اور اپنے خسر کی وفات کے بعد انھوں نے اس مقصد سے فیروز پور، جھرکہ اور لوہارو کا رخ کیا کہ وہ نواب احمد بخش خاں سے مل کر اس مسئلے کو طے کریں کہ اُن کے وظیفے کی رقم میں کوئی دوسرا شخص کیوں شامل کیا گیا ہے۔

نواب صاحب اس وقت بھرت پور میں تھے اور ان افواج انگلیشیہ کے ساتھ تھے جنھوں نے جنرل آکٹر لونی کی کمان میں بھرت پور کے قلعے کو گھیر رکھا تھا۔ غالب بھی بھرت پور پہنچے اور کچھ زمانے تک وہاں قیام بھی کیا مگر نواب صاحب سے کوئی ایسی بات نہ ہو سکی جس سے مقصد براری کی کوئی امید ہو۔ واپسی میں وہ کچھ دن لوہارو میں بھی مقیم رہے۔ جب نواب صاحب کے رویے سے مایوس ہو کر وہ واپس ہوئے تو دہلی آنے کے بجائے انھوں نے اس امید پر کہ وہ براہِ راست گورنر جنرل سے کلکتہ پہنچ کر اس مسئلے کو طے کرائیں گے دیارِ مشرق کے سفر کا ارادہ کیا۔

وہ دہلی آنے سے اس لیے کتراتے تھے کہ قرض خواہوں کی دارو گیر سے بچنا چاہتے تھے۔ کلکتہ بہت فاصلے پر واقع ایک شہر تھا اور غالب اخراجات سفر کی طرف سے پریشان تھے۔ وہ کانپور اور وہاں سے لکھنؤ پہنچے اور کافی دنوں تک وہاں قیام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دربار یا امرائے دربار کی طرف سے ان کی مالی سرپرستی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ انھوں نے لکھنؤ کے اس قیام کا ذکر اپنی ایک غزل میں کیا ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

اسی غزل میں یہ شعر بھی آیا ہے۔

لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ

جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

یہ توقع غالبؔ کو کلکتہ سے تھی۔

اب یہ اتفاق ہے کہ غالبؔ کو حسب دل خواہ کوئی کامیابی یہاں لکھنؤ میں ہوئی نہ کلکتہ میں بلکہ ان کی مشکلات میں اخراجات سفر کے باعث اور اضافہ ہو گیا۔

(غالبؔ کے سفر کلکتہ پر تفصیلی معلومات کے لیے ایک lesson الگ سے لکھا جا رہا ہے)

کلکتہ میں غالبؔ کا قیام دو برس سے کچھ زیادہ رہا۔ آخر ۱۸۲۹ء میں واپس آ گئے۔ اس لیے کہ جو مقدمہ انھوں نے کلکتہ میں پیش کر دائر کیا تھا وہ دہلی ریزیڈینسی کی طرف سے واپس کیا جا چکا تھا۔ یہ مقدمہ دہلی میں ان کی مرضی کے خلاف فیصل ہوا جس کا ذکر ان کے خطوط میں اس وقت بھی آیا اور اس کے بعد بھی آتا رہا۔

دہلی میں غالبؔ کی زندگی ایک طرح سے ادبی مشاغل میں گزرتی تھی۔ آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ان میں اپنا فارسی اور اردو کلام سناتے رہتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں قلعۂ معلیٰ تک ان کی رسائی ہو چکی تھی۔ غالبؔ نے اس زمانے میں زیادہ تر خطوط فارسی زبان میں لکھے اور قصیدے بھی۔ ان کے فارسی خطوط میں اس کا ذکر بھی آیا ہے کہ ۴۲-۱۸۴۱ء میں قلعے میں جو مشاعرے ہوتے تھے اس میں وہ خصوصیت کے ساتھ اپنا فارسی کلام پیش کرتے تھے۔ یہ مشاعرے اکثر ساری ساری رات چلتے تھے۔ اساتذۂ فن کا نمبر آخر میں آتا تھا۔

۱۸۴۱ء کے قریب ان کا اردو دیوان مرتب ہو کر شائع ہوا۔ ان کے فارسی خطوط کا مجموعہ یا فارسی کلام بھی مرتب ہو چکا تھا مگر اشاعت کی نوبت اس وقت تک نہیں آئی تھی۔ ۱۸۵۰ء کے قریب جب بہادر شاہ ظفر دہلی کے تخت سلطنت پر رونق افروز تھے غالبؔ کی رسائی باقاعدہ قلعۂ معلیٰ تک ہو گئی اور وہ بادشاہ کی طرف سے مغلوں کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے۔ ۵۰ روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر ہوا جو چھ ماہ کے بعد ان کو ملتا تھا۔ دربار شاہی سے ان کو نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ بیگ خاں عارف جنگ کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔

مغلوں کی تاریخ سے متعلق مواد حکیم احسن اللہ اکٹھا کر کے ان کو دیتے تھے اور غالب اپنے خاص انداز میں اسے لکھتے تھے مگر ۱۸۵۷ء تک غالب اس تاریخ کا صرف ابتدائی حصہ ہی لکھ پائے جو "مہر نیم روز" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا حصہ جس میں مغلوں کی ہندوستان پر حکومت کا تذکرہ ہوتا وہ لکھا ہی نہیں گیا۔ غالب اس کا نام "ماہ نیم ماہ" رکھنا چاہتے تھے مگر وہ مکمل ہی نہیں ہوا۔

اس اثناء میں شہزادہ ولی عہد مرزا فخرو کی طرف سے بھی ۴۰۰ روپیہ سال ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بادشاہت بھی ختم ہوئی۔ شہزادگی بھی اور قلعے کی برائے نام سلطنت بھی۔

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں غالب نے خود کوئی حصہ نہیں لیا، اس پر بھی انگریز کمپنی بہادر کے دوبارہ دہلی پر قبضے کے بعد پہلے وہ گرفتار ہوئے مگر رہا کر دیے گئے۔ پھر بھی ان کا وظیفہ بند ہو گیا اور انگریز کمپنی کی طرف سے ان کا کاروبار بھی موقوف ہوا جس کے لیے غالب کو کئی سال بحالی کی جدوجہد کرنا پڑی۔ اس میں نواب یوسف علی خان آف رامپور نے غالب کی سفارش بھی کی اور ان کی سرپرستی بھی۔ نواب یوسف علی خاں جو ناظم تخلص کرتے تھے غالب کے شاگرد بھی ہو گئے اور ۱۰۰ روپے ماہوار ان کو وظیفہ دیتے تھے۔

اس زمانے سے پہلے ایک بار غالب کی قرض داری اور ان کے مکان پر جوا کھیلے جانے کے باعث ان کی گرفتاری بھی عمل میں آئی تھی اور انھوں نے اپنی اسیری کا زمانہ دہلی کے کسی زنداں خانے میں گزارا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد شہر دہلی میں جو حالات گزر رہے تھے اور جن مصائب سے مغلوں کا یہ تاریخی شہر دوچار تھا، اس کے بارے میں غالب کے اس دور کے اردو خطوط میں بہت سی تفصیلات ملتی ہیں جو ایک طرح سے اس تاریخی شہر کی ابتلا کا ایک اہم ریکارڈ ہے۔

غالب کے ان خطوط کا اکثر ذکر آتا ہے اور ان کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں۔ غالب کی خانگی زندگی کوئی مطمئن زندگی نہیں تھی۔ پھر بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ خوش و خرم رہتے تھے۔ ان کے اپنے یہاں جو اولاد ہوئی وہ بہت تھوڑی عمر میں فوت ہو گئی۔ ان کی بیگم نے اپنے بھانجے عارف کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا مگر ان کا بھی جلدی انتقال ہو گیا اور اپنے بعد انھوں نے دو یتیم بچے چھوڑے۔ ایک کا نام حسین علی خاں تھا اور دوسرے کا باقر علی خاں کامل تھے۔ یہ شاعری کرتے تھے۔ ان دونوں کی سرپرستی میں بھی غالب اور ان کی بیگم نے حصہ لیا۔ جب غالب

نواب یوسف علی خاں سے ملنے کے لیے گئے تھے تو ان دو بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اپنی اولاد ہی کی طرح ان کو چاہتے تھے۔

غالبؔ کا آخری دور زندگی بہت ہی پریشانیوں میں گزرا۔ یہ ان کی مالی پریشانیوں کے باعث بھی تھا اور بیماریوں کے باعث بھی۔ جس کا ذکر ان کے اردو خطوط میں بار بار اور جگہ جگہ آیا ہے۔

اُسی زمانے میں وہ قاطع برہان کے معارضہ کی وجہ سے بھی پریشان رہے۔ انھوں نے فارسی کی مشہور کتاب "برہان قاطع" پر جو اعتراضات کیے تھے اس کا ادبی ہنگامہ کافی دنوں تک ان کے ذہن کو پریشان کرتا رہا مگر ایسا اور اتنا ضرور ہوا کہ ان کی بعض تصانیف شائع ہو گئیں۔ ان میں فارسی کلیات بھی تھا اور اردو خطوط کے دو مجموعے "اردوئے معلےٰ" اور "عودِ ہندی" بھی شامل تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں غالبؔ کا دہلی میں انتقال ہو گیا اور وہ بستی حضرت نظام الدین میں اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہاں ان کا پختہ مزار اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دورِ غالب کا تاریخی و معاشرتی ماحول

غالب اپنے بیان کے مطابق دسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء تک زندہ رہے۔ یہ بہتر برس کا زمانہ غالب کے سوانحی کوائف کے اعتبار سے بے حد اہم ہے اور خود شہر دہلی اور ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کے نواب اور سلطنت خداداد کے حکمراں ٹیپو سلطان کو سرنگا پٹم کے تاریخی معرکے میں شکست ہوئی اور انگریز حکومت کے قیام میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ایک بڑی قوت ختم ہوگئی۔ مرہٹوں اور حیدرآباد کے نظام نے انگریزوں سے صلح کر لی اور وہ بھی ہندوستان کی بہت سی دوسری ریاستوں کے ساتھ انگریزی بندوبست کا حصہ بن گئے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی افواج نے جنرل اکٹرلونی (Actor Lony) کی کمانداری میں انگریزی افواج دہلی پر قابض ہوگئیں جو اس وقت مرہٹوں کے زیر عملداری ایک شاہی شہر تھا۔ شاہ عالم ثانی کی حکومت لال قلعہ کی چاردیواری تک محدود ہوکر رہ گئی تھی اور مرہٹوں کی طرف سے مغل شہنشاہ کو صرف چھ ہزار ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور اسی میں اس روایتی سلطنت کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ اصل اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ شمالی ہند کے دوسرے شاہی شہر آگرے پر بھی اسی زمانے میں انگریز کمپنی بہادر کی افواج کا تسلط ہوگیا۔ اس وقت آگرے کے قلعہ کا افسر اعلیٰ ایک فرانسیسی تھا جو مرہٹوں کی ملازمت میں تھا اور نائب قلعہ دار غالب کے اپنے چچا مرزا نصراللہ خاں بیگ تھے۔

مرہٹوں کی شکست کے بعد مرزا نصراللہ بیگ خاں انگریزی افواج سے مل گئے اور لارڈ لیک سے قریب آگئے۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ہاتھی سے گر کر مرزا نصراللہ کی سوانحی عمری میں لکھا گیا ہے کہ لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خان کے وارثوں کی حیثیت سے ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف اور ان کی بہن کی پنشن مقرر کردی۔

۱۸۰۳ء کے تین برس بعد شاہ عالم ثانی کا انتقال ہوگیا اور اکبر شاہ ثانی ان کے بیٹے قلعہ معلیٰ کے

مسند نشین بن گئے۔ انگریزی عملداری کے بعد سیاسی ابتری اور انتظام میں خلل پڑنے کے اندیشے تو ختم ہوئے مگر انگریزی عملداری میں ہندوستانی امراء اور رؤساء بیشتر اپنے خاندانی عزت و وقار سے محروم ہو گئے۔ ۱۸۲۵ء میں انگریز کمپنی بہادر کے افسران نے قدیم دہلی کالج قائم کیا جو غازی الدین خاں کے مدرسے کی صورت میں پہلے سے موجود تھا، لیکن اب اُسے ایک نئے ادارے کی شکل دی گئی اور اس میں نئی تعلیمات کا بھی انتظام کیا گیا۔ اب ہم اُسے قدیم دہلی کالج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس وقت تمام ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہو چکا تھا۔ صرف پنجاب کی سکھ ریاستیں اور خاص طور پر رنجیت سنگھ کی حکومت انگریزی عملداری سے آزاد تھی۔ یہ اپنی جگہ پر ایک مضبوط حکومت تھی اور اس کے افسران فوج فرانسیسی تھے۔ رنجیت سنگھ بھی اپنی جگہ پر ایک پُر قوت حکمراں تھے۔ ۱۸۳۹ء میں اس کا انتقال ہوا تو پنجاب کی یہ ریاست بھی پہلے اندرونی خلفشار کا شکار ہوئی اور ۱۸۴۹ء میں شکست کی لڑائی کے بعد اس ریاست پر بھی عملاً انگریزوں کا ہی قبضہ ہو گیا اور آسام سے سندھ و سرحد تک شمال میں اور کنیا کماری تک جنوب میں جتنے علاقے تھے سب انگریزی افواج کے قبضہ میں آ گئے۔ انگریزی عملداری کے ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی رواج ہوا۔ اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ اردو زبان میں سب سے پہلے "جامِ جہاں نما" اخبار کا ضمیمہ شائع ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں دہلی سے پہلا باقاعدہ اردو اخبار نکلا۔ یہ "دہلی اردو اخبار" ہی کہلاتا تھا اور اکیس برس تک جاری رہا۔

"دہلی اردو اخبار" کے ایڈیٹر مالک اور مہتمم مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر تھے۔ "دہلی اردو اخبار" کے بعد بعض دوسرے اخبارات بھی نکلے۔ دہلی کالج کی اپنی اہمیت انگریزی کلاسوں کے جاری ہونے کے بعد کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کالج میں پہلی بار سائنسی تعلیم کا بھی انتظام ہوا اور اس کے ذریعے سائنسی تجربوں اور نظریوں کا ذکر بھی دہلی کے شہری معاشرے میں ہونے لگا۔

فورٹ ولیم کالج اس سے بہت پہلے ۱۸۰۰ء میں کام کر رہا تھا اور ۱۷۹۹ء کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ اس میں انگریزی کمپنی بہادر کی ملازمت میں آنے والے یورپی افسران کو ہندوستانی زبانیں، ہندوستانی تہذیب و

تاریخ کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی تھیں اور ایک طرح سے ان کی تربیت کا یہ ادارہ ایک مرکز تھا۔ اس میں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام خاص طور پر کیا گیا تھا اور صاف ستھری بامحاورہ زبان میں کتابیں لکھوائیں یا ترجمہ کرائیں گئیں تھیں۔ "باغ و بہار"، "آرائشِ محفل"، "گنج خوبی" اور "خرد افروز" جیسی کتابیں اسی کالج کے زیرِ اہتمام اردو میں یا لکھی گئی تھیں یا پھر ترجمہ کی گئیں تھیں اور اس کام کی انجام دہی کے لیے جان گلکرسٹ کو ترجمہ اور تخلیق کے اس شعبے کا انچارج بنایا گیا تھا۔ یہ کالج کچھ دن تک کام کرتا رہا اور اس کے بعد انگریزوں نے اس کو بند کر دیا۔

غالبؔ ۱۸۲۸ء میں جب کلکتے پہنچے تو اس کالج کا ذکر باقی تھا مگر خود کالج ختم ہو چکا تھا۔ کلکتہ نئی انگریز حکومت کا اس وقت ایک مرکزی شہر تھا اور نئے انتظام حکومت اور معاشی ڈھانچے کے اعتبار سے یہ کہیے کہ ایک نمونے کا شہر تھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوں میں بہت تعریف کی ہے۔ اور اس کو دہلی آگرے سے اور بنارس جیسے شہروں پر ترجیح دی ہے۔ کلکتے میں بھی غالبؔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ وہیں ادبی تنازعات بھی پیش آئے جو اس زمانے کی ایک عام ادبی روش تھی۔ دہلی میں بھی ہم شاہ نصیر، ذوقؔ اور ان کے معاصرین کے مابین اس طرح کی کشمکش دیکھتے ہیں اور اس سے کچھ پہلے انشاؔ، مصحفیؔ اور دوسرے شعراء کے یہاں بھی۔

انگریزی حکومت نے اس طرح کی ادبی activities یا شعری دلچسپیوں کی حوصلہ افزائی یا قدر فرمائی نہیں کی۔ ان کا کلچر اور مزاج بھی یہ نہیں تھا۔ اگرچہ غالبؔ جیسے ایک شاعر کو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو اس وقت کے بڑے افسران ہیں، برابر تحسین و تہنیت والے قطعے اور قصیدے پیش کرتے رہتے ہیں اور اس کے صلے میں انعام و اکرام یا سرکاری سطح پر اعزاز و احترام چاہتے ہیں لیکن انگریزوں کا اپنا تہذیبی مزاج اور تعلیمی اور ترقی انداز نظر سے ان باتوں کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ شروع شروع کی بات الگ ہے۔ رفتہ رفتہ وہ ہندوستانیوں سے تکلف سے ملنے لگے تھے اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان انگریز افسران کے گھر پر ہندوستانی بے تکلفی سے آتے جاتے رہیں۔

دہلی کالج کی وجہ سے ذہن بدلنا شروع ہو گئے تھے اور نئی طرح کی اسکالر اور سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والے افراد ہمارے علمی اور ادبی معاشرے میں نظر آنے لگے تھے۔ اخبارات اور رسائل نے ہمیں اپنے شہر اور اپنے معاشرے سے باہر بھی دوسروں سے ذہنی رشتہ پیدا کرنے کے مواقع فراہم کر دیے تھے۔ "خیر خواہ ہند" اور "محبِ ہند"

نام کے دو ادبی رسالے قدیم دلی کالج کے ایک طالب علم اور استاد ماسٹر رام چندر نے نکالے تھے۔ "فوائد الناظرین" دھرم نرائن نکالتے تھے۔ وہ بھی قدیم دلی کالج کے طالب علم تھے۔ "قلعۂ معلّی" سے بھی اخبار نکلتا تھا۔ وہاں ایک مطبع بھی قائم تھا جو مطبع سلطانی کہلاتا تھا۔ "دہلی اردو اخبار" کا اپنا مطبع تھا۔ شاہدرہ دہلی میں ایک اور مطبع بھی تھا جہاں سے بعض قدیم دواوین اور کتب و رسائل کی اشاعت عمل میں آتی تھی۔

دلی کالج میں ایک ورنا کیولر سوسائٹی بھی بنائی گئی تھی جس نے اس زمانے میں بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے قدیم دلی کالج پر اپنی کتاب "مرحوم دلی کالج" میں اس کی نشاندہی کی ہے کہ اس سوسائٹی میں ۱۷۱ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ ترجمہ کرنے والوں میں مولوی کریم الدین بھی شامل تھے جو پانی پت کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مسٹر فیلن کے ساتھ مل کر تاریخ ادبیات ہندوی اور ہندوستانی کا اردو ترجمہ کیا تھا جو "طبقات شعرائے ہند" کے نام سے دلی کالج کے مطبع ہی سے چھپی تھی۔ واقدی کی تاریخ بھی اس مطبع نے چھاپی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی قانون کے ترجمے بھی ہوتے تھے۔ اس میں بھی قدیم دلی کالج کی اس سوسائٹی نے حصہ لیا تھا۔ قدیم دلی کالج میں مولوی عبدالکریم نے مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا۔ ان میں سے ایک مشاعرے کے شاعروں کا حوالہ ان کے یہاں "تذکرۂ طبقات شعرائے ہند" میں بھی موجود ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دلی کالج کا آخری یادگار مشاعرہ" لکھا ہے۔

مرزا غالبؔ نے اگرچہ دلی کالج کی ملازمت اختیار نہیں کی مگر دلی کالج سے وابستہ طلباء اور اساتذہ کو وہ بخوبی جانتے تھے اور ان کی ذہانت میں اس دور کے نئے فکری رجحانات اور ادبی رویوں کو بھی ضرور پسند کیا ہوگا۔ ان کے خطوں میں جو نئی باتیں اور نئے رجحانات ملتے ہیں، ان کو ہم دلی کے علمی اور ادبی ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ غدر کے بعد اپنے زمانۂ حیات میں رسالہ دہلی سوسائٹی کی ادبی انجمن سے بھی وابستہ رہے جس کے صدر نواب امین الدین احمد خاں تھے۔ اس سوسائٹی نے بھی دلی کی ادبی فضا کو بدلنے میں بہت کچھ حصہ لیا۔

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کا اثر شہر دلی نے بھی قبول کیا۔ ملک کی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئی اور انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی پر بھی اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ بادشاہت ختم ہوگئی۔ باغیوں کو انگریزوں نے سخت سزائیں دیں اور اس کے بعد مغل سلطنت کا نام ونشان مٹ گیا۔ اگرچہ یہ بات اسے پہلے ہی طے ہو چکی تھی

کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد بادشاہت ختم کر دی جائے گی۔ شاہی خاندان قلعہ خالی کر دے گا اور مرزا فخرو جو بادشاہ کے ولی عہد مقرر ہوئے تھے، وہ قطب صاحب میں جا کر رہیں گے اور محض Prince یا شہزادے کہلائیں گے، بادشاہ نہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ شاہی ادارہ ختم ہو جائے گا اور قلعے پر بھی شاہی خاندان کا قبضہ نہیں رہے گا۔ جس پر بادشاہ ظفر نے یہ شعر کہا تھا۔

اے ظفر ہے اب تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

اب ہنگامۂ غدر نے اس تمام صورت حال کو اور زیادہ الم ناک بنا دیا۔ بادشاہ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور رنگون اور وہاں سے مانے بھیج دیے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں غالب کے تین سال پہلے انھوں نے انتقال کیا۔ وہیں ان کی قبر بھی ہے۔

جاگیرداری نظام اگرچہ ہندوستان میں اس واقعے کے بعد جسے انقلاب کہنا چاہیے کافی زمانے تک قائم رہا۔ راجواڑے بھی رہے، ریاستیں بھی اور جاگیریں بھی اور جاگیرداریں بھی۔ اس کا اثر ہماری تہذیب پر بھی رہا۔ مرزا غالب خود اپنی طبیعت و مزاج کے اعتبار سے جاگیردارانہ مزاج رکھتے تھے اگرچہ ان کے پاس ضلع جاگیر کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا وظیفہ تھا اور وہ بھی زمانۂ غدر میں بند ہو گیا تھا اور مشکل سے جاری ہوا مگر اس پر بھی ان کی طبیعت سے جاگیردارانہ مزاج اور اس کی "خو بو" نہ گئی۔ ان کے لیے قرض داریاں بھی اسی کا حصہ تھیں اور اپنی وسعت سے بڑھ کر دوسروں کی مدد اور پرورش کا جذبہ بھی۔ جب وہ کلکتہ گئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قرض دار ہیں اور مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔ مگر تین تین چار چار ملازم رکھے ہیں اور اسی کے ساتھ سواری کے لیے گھوڑا بھی۔ دلی میں وہ بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے اور ان کا دسترخوان بھی رئیسانہ انداز سے سجا رہتا تھا۔ خود بھی اچھا کھاتے تھے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی وضع داریوں کو آخری وقت تک نبھایا۔ آخری عمر میں بیمار زیادہ رہتے تھے لیکن خلعت و دربار کی طرف سے کبھی بے توجہی اختیار نہیں کی۔ ہمیشہ اسے اہمیت دیتے رہے۔ شاعری کے سہارے زندگی گزاری مگر سوچنے کا انداز یہ تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالبؔ کا فن اور ان کی نثری تصانیف

غالبؔ کے فن پر گفتگو دوسرے نگارش ناموں کے ذیل میں بھی آچکی ہے۔ ان کو اپنے زمانے کے مروجہ فنوں میں سے کوئی اور فن نہیں آتا تھا جس کو انھوں نے پیشے کے طور پر کیا ہو یا جس سے وہ زندگی بھر کام لیتے رہے ہوں۔ مثلاً فنِ طبابت یا فنِ خوش نویسی یا فنِ سپاہ گری جس کو وہ اپنا آبائی فن بتاتے ہیں۔ وہ شاعروں کو اپنے لیے ذریعہ عزت بھی نہیں بنانا چاہتے مگر زندگی بھر شاعری کرتے رہتے ہیں اور اپنے خاندانی وظیفے کے علاوہ جو کچھ ان کی آمدنی ہوتی تھی وہ فنِ شاعری ہی سے ہوتی تھی۔

نثر نگاری ان کا کوئی فن نہیں تھا۔ وہ بادشاہ کی طرف سے مغلوں کی تاریخ لکھنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق ضروری مواد ان کو حکیم احسن اللہ خاں فراہم کرتے تھے، وہ تو پورے طور سے عبارت آرائی اور انشا پردازی کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے مگر اس سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی کہ وہ سات برس تک ڈیڑھ دو سو صفحات کے علاوہ کچھ لکھ نہیں پائے اور مغلوں کی جو تاریخ انھوں نے لکھی وہ عہدِ ہمایوں تک آکر ختم ہوگئی۔ ہمایوں سے بہادر شاہ ظفر تک جو ہندوستان میں مغلوں کی تاریخ تھی، وہ لکھ ہی نہیں پائے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا اور وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بادشاہت ختم ہوگئی اور قلعۂ معلی شاہی خاندان سے خالی کرا لیا گیا۔

انھوں نے معلمی کا فن بھی اختیار نہیں کیا اور دلی کالج کی ملازمت سے دست برداری دے دی کہ حالیؔ کے بیان کے مطابق ان کو وہ مل رہی تھی مگر وہ ذرا سی بات پر غیر مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔ اس اعتبار سے غالبؔ کا فن نثر نگاری اور شاعری میں قرار پایا اور وہی زندگی بھر ان کے ساتھ رہا اور ان کے لیے وجہِ افتخار اور سببِ عزت بنا۔ Self expression کی بات الگ ہے کہ وہ بھی بڑا کام ہے۔ آدمی کی شخصی زندگی کے لیے بڑی بات ہے کہ اسے بات کرنے کا سلیقہ آجائے اور اس حد تک آجائے کہ پھر دوسرے اس سے سیکھیں اور زمانہ بہ زمانہ اس کا اثر ہو۔

اردو شاعری میں انھوں نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں تھے۔ اسی لیے انھوں نے

اپنے ایک مشہور شعر میں یہ کہا تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

(فارسی کو دیکھو تا کہ تم رنگا رنگ نقش دیکھ سکو اور مجموعہ اردو سے گزر جاؤ کہ وہ تو بے رنگ ہے۔ بے کشش ہے۔)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کن باتوں سے اپنے فن کا معیار تصور کرتے تھے۔ رنگا رنگ نقش دراصل تصویری مرقعے ہیں۔ وہ شعری Images ہیں جو ان کے یہاں "اوراقِ مصور" کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے اور غالب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مرقع نگاری، پیکر آرائی، تصویر تراشی اور لفظی تصویریں پیش کرنا ان کا فن ہے جو اردو شاعری میں بھی سامنے آتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی اپنی تمام تر دل آویزیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

اردو میں نثر نگاری انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد شروع کی۔ اس سے پہلے انھوں نے جو کچھ لکھا وہ فارسی نثر میں لکھا۔ کوئی ایک آدھ اردو تحریر یا نثر پارہ موجود ہو یہ ممکن ہے۔ مگر وہ ہمارے علم یا غالب کے ادبی ریکارڈ میں موجود نہیں۔

انھوں نے فارسی نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ یہ "مہر نیم روز" کی صورت میں بھی محفوظ ہے اور "دستنبو" کی شکل میں بھی، جو غدر کے حالات سے متعلق ہے۔ "برہان قاطع" پر تنقید کے دوران ان کے قلم سے بہت سے نثر پارے سامنے آئے۔ اپنے دوسرے نگارش ناموں میں بھی وہ اپنے فنی خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ان سب کو "پنج آہنگ" میں اکٹھا کیا گیا ہے جو غالب کی فارسی زبان میں نثری نگارشات کا مجموعہ ہے اور غالب کی زندگی ہی میں اسے ترتیب دے دیا گیا تھا اور وہ کتاب چھپ گئی تھی۔

ادھر اُدھر سے جو کچھ علاوہ بعد میں چھاپا گیا۔ اردو نثر میں بھی ان کے دو مجموعے مرتب ہوئے جو خطوط کے مجموعے ہیں۔ ان میں سے ایک کی اشاعت "اردوئے معلی" کے نام سے عمل میں آئی اور دوسرا مجموعہ "عود ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ جیسا کہ اس کا ذکر آتا ہے ان کے بعض اور خطوط ملے تو انھیں پروفیسر مسعود حسن رضوی نے متفرقاتِ غالب کے نام سے شائع کیا۔

غالبؔ کی نادر تحریریں بھی ان کے قلمی آثار میں آتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کے تمام اُردو خطوط کو اپنے حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں نئے اور پرانے بھی خطوط شامل ہیں۔ ''مکاتیب غالبؔ'' کے نام سے مولانا امتیاز علی خان عرشی نے وہ سب خط مرتب کیے جو غالبؔ نے نوابان رامپور کو لکھے تھے۔ یہ غالبؔ کے ادبی مکتوبات نہیں ہیں بلکہ رامپور کے دربار کو بھیجے ہوئے عرضوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں فنی خوبیاں مشکل سے ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

غالبؔ کے اُردو خطوط کو بعض دوسرے ناموں یا عنوانات کے ساتھ جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے فن مکتوب نگاری کے کچھ امتیازی گوشے سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک فارسی خطوط کا سوال ہے ان میں خطوط کا وہ مجموعہ بھی ہے جو ''پنج آہنگ'' میں شامل تھا اور جسے اردو میں ترجمہ کر کے ''اوراقِ معنی'' کے نام سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اردو اکیڈمی دہلی سے شائع کرایا ہے۔ غالبؔ کا دوسرا مجموعہ جو غالبؔ صدی کے موقعہ پر غالبؔ کے نودریافت خطوط کی صورت میں ''نامہ ہائے غالبؔ'' کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اسے علی اکبر ترمذی صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسے ''نقشِ نیم رخ'' کے نام سے پیش کیا ہے اور جو غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔

''معاصر غالبؔ'' کے نام سے غالبؔ کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اس میں اور ''نامہ ہائے غالبؔ'' میں کچھ خطوط مشترک بھی ہیں پھر بھی یہ ایک جداگانہ مجموعہ ہے۔ یہ خطوط غالبؔ نے کن دوستوں اور قریب تر لوگوں کے نام لکھے ہیں ان کا حال معلوم نہیں۔ مگر بعض خط ایسے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مرزا احمد بیگ تپاںؔ کو لکھے گئے ہیں جن سے غالبؔ خلوص خاطر رکھتے تھے اور اپنائیت کے رشتوں کے ساتھ ان کو یاد کرتے تھے۔ مرزا احمد بیگ تپاںؔ کلکتہ میں رہتے تھے۔ دہلی یا اس کے قرب و جوار کے رہنے والے تھے اور شائستہ مزاج شخص تھے۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں چاہے وہ فارسی میں ہوں یا اُردو میں ہوں، ایک ایسی روشِ تحریر اور طرزِ مکتوب نگاری کو پسند کیا اور رواج دیا جو آج ان کا فن خیال کی جاتی ہے۔ وہ خود بھی اسی بات کے آخر میں دعویدار ہو گئے تھے کہ انھوں نے مکتوب نگاری کو ایک نیا اسلوب تحریر دیا ہے اور خود اسے ایک فن بنا دیا ہے۔ انھوں نے مرزا حاتم

علی بیگ تفتہ میر کو ایک خط لکھا ہے اور اس میں بڑے برجستہ انداز میں یہ فقرے رقم کیے ہیں:

"مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ
مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم
باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ یہ
تمھارے جی میں یہ کیا آئی ہے کہ تم نے مجھ سے باتیں
کرنے کی قسم کھائی ہے۔"

ایسا تو نہیں کہ مرزا صاحب کے تمام خط اسی طرح بے تکلف ہوں اور بات چیت کا انداز رکھتے ہوں۔ بعض خطوں میں جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے انھوں نے اس طرح کے القاب و آداب بھی استعمال کیے ہیں جن کو قدیمانہ روایت سے وابستہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی غلط بات بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ ہر آدمی سے ہمارے بے تکلفی کے تعلقات نہیں ہوتے۔ ہم اس کے درجے اور مرتبے کو ذہن میں رکھ کر بات کرنے پر اس معنی میں مجبور ہیں کہ ایسے مواقع پر شائستگی اور بات کرنے کے سلیقے کے معنی یہی ہیں کہ ایک تکلف برتا جائے۔

سادہ زبان میں بات کرنا اور ہوتا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری الفاظ کا استعمال ایک ایک مفہوم یا معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ کچھ اور ہوتا ہے۔ درباروں سے خط و کتابت یا عرض معروض سے جو آداب تھے وہ غالب بھی برتتے تھے۔ امرا، اہل دولت اور معاشرے کے بہت ممتاز افراد سے بے تکلف زبان میں بات ہو ہی نہیں سکتی۔ وہاں تکلف انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ تکلف اور بے تکلفی کا رشتہ موقع اور محل کے مطابق ہوتا ہے اور بے تکلفی اگر توازن سے ہٹ جائے۔ ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ جائے تو اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہم ذوق کی زبان میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

غالب نے خطوط میں جو بے تکلفی اختیار کی تو غیر ضروری تکلفات کو ترک کرتا تھا۔ وہ شائستگی، حسن کلام اور لطف زبان سے الگ نہیں ہوئے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر ان کی مکتوب نگاری ایک فن نہ تھی محض عامیانہ سطح کی

پابند ہوتی۔ ان کا ایک شعر اس موقع پر یاد آتا ہے۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اور ہم جانتے ہیں کہ غالبؔ رسم و رہِ عام سے بچنا اور اپنی راہ الگ بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری خصوصاً اپنی غزل میں بھی ایسا ہی کیا اور خطوط میں بھی قصیدوں میں بھی جگہ جگہ ان کے یہاں جدتیں طرزِ ادا اور ندرتِ فکر ملتی ہے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے اپنے فارسی قصائد کو ایک نیا فن بنا دیا۔

اردو میں اس طرح کے مکتوب نگاری کے نمونے اگرچہ اس دور میں بھی کچھ مل جاتے ہیں مگر آئندہ کے لیے وہ ایک فن اور ایک خاص طرزِ ادا کے طور پر رائج ہو اور اسے ایک خاص شخصیت کے ساتھ نسبت دے کر رائج کیا جائے۔ تخلیقی معنوں میں یہ ایک شرط ہوتی ہے اور جب کوئی چیز فن بنتی ہے یا فن کا درجہ اختیار کرتی ہے تو اس کے ساتھ نیا پن بھی وابستہ ہوتا ہے، نئی سوچ بھی اور نئی اپروچ approach بھی۔ اسی کے تحت یا زیرِ اثر اس کے اصول اور ضابطے بھی مقرر کیے جاتے ہیں۔ جب تک کچھ ایسے ضابطے نہ ہوں کہ جن کی بنیاد پر اس فن کی خاص پہچان ہو سکے کہ اس میں کیا ہے اور کیسے ہیں، اس وقت تک اسے فن نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے لوگ جو اس فن کو سمجھیں گے، اس پر غور کریں گے اور اس سے اخذ نتائج کریں گے۔ ان کے سامنے کچھ ضابطے ضرور ہوں گے جنھیں وہ اپنے طور پر بھی سمجھ سکتے ہیں اور خود فن کار کی طرف سے بھی ایسے اشارے موجود ہونے چاہئیں جن کی روشنی میں فن کی خوبیوں کو پرکھا جا سکے۔

غالبؔ اپنی تصنیف "پنج آہنگ" میں جو رسالہ شامل کیا تھا وہ مکتوب نگاری کے دستور و آداب سے متعلق تھا اور اس طرح ہم اس رسالے کی روشنی میں مرزا غالبؔ کے خیالات کو سمجھ سکتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شعوری یا نیم شعوری طور پر وہ اپنے زمانے سے بھی متاثر ہوئے۔ حالات کی تبدیلیوں نے بھی ان کے ذہن اور زندگی کو بدلا۔ ان کے دور کے تقاضوں نے ان کے فکر کو نئی راہ دکھلائی۔ مگر ان کا ذہن اور اخذ کرنے والی قوت بھی اس میں شامل رہی۔ وہ جدت کے بھی قائل ہیں۔ اس کے دل کش نمونے بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی وہ اپنی تحریروں کا ذکر آ چکا ہے جو بے نقط ہیں اور کسی بھی لفظ میں ایسا کوئی حرف نہیں آیا جو نقطے دار ہوتا ہے۔ تحریر کی یہ صفت،

صفت تعطیل کہلاتی ہے۔

ایک خط انھوں نے فارسی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو ایسا بھی لکھا ہے جس کا ہر فقرہ ایک آزاد مصرعہ بنا ہوا ہے اور اس طرح وہ شروع سے آخر تک آزاد شاعری کا نمونہ ہے۔ ان کے یہاں قافیہ پیمائی اور ردیفوں سے آراستہ فقرے بھی ملتے ہیں اور ادھر سے ادھر تک ان کی تحریروں میں جگہ جگہ اس طرح کی عبارتوں کو دیکھا جا سکتا ہے جنھیں انھیں کے لفظوں میں انداز سے کل افشانی گفتار کہنا ممکن ہے۔ وہ "آرائش گفتار" کے قائل ہیں اور ایک موقع پر انھوں نے یہ مصرعہ بھی تحریر کی آراستگی اور تقریر کی خوب صورتی کے اظہار کے لیے لکھا ہے۔

ہم کو سرمایۂ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے

باتیں بنانا یا بات میں سے بات یا نکتے میں سے نکتہ پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ اسی لیے حالی نے ان کو حیوان ظریف کہا ہے۔ اس اپنی خوبی کو انھوں نے اپنے مکتوبات میں ڈھال دیا اور چٹکلے چھوڑتے رہے۔ خطوں میں بھی جو وہ اپنے بے تکلف عزیزوں اور دوستوں کو لکھتے رہے، وہ اس طرح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے جس میں سننے اور پڑھنے والے کو لطف آئے۔ اس کا اظہار ان کے خطوں سے بھی ہوتا ہے کہ بعض ان کے دوست اور شاگرد ایسے تھے کہ جب غالب کا خط ان میں سے کسی کے نام جاتا تھا تو وہ خوش ہو ہو کر اسے پڑھتے اور اپنے دوسرے دوستوں کو اس خوشی میں شریک کرتے تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ تمھارے فلاں دوست بیٹھے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی عدم موجودگی میں تمھیں خط نہ لکھوں۔ جب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آخر تم یہ کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں، ان کا جواب یہ ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب آپ کا خط وہاں جائے اور پڑھا جائے تو میں بھی وہاں ہوؤں۔ اس کو میں بھی پڑھوں۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو میں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط وہاں پہنچے اور میں اس کے پڑھنے کی خوشی اور لطف سے محروم رہوں۔

اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ غالب اپنے بے تکلف طرز اظہار کی خوبیوں سے خود بھی واقف تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ دوسرے اس سے دل چسپی لیتے ہیں اور شوق سے ان کے خط پڑھتے ہیں۔ پنجاب کے احاطے میں بھی ان کے بیان کے مطابق ان کے خط بہت مقبول تھے۔ پانی پت میں اور اس کے ساتھ فیروز پور،

پھر کہ اور لوہارو میں تو ان کے عزیز رہتے ہی تھے اور ان کے خطوں کو پسند کرتے تھے۔ غالب نے اس پسندیدگی کو دیکھ کر اور اپنے اسلوبِ مکتوب نگاری کی خوبیوں کا احساس کر کے یہ خط بھی لکھے تھے۔ بہت سے خطوط ان کے ادبی شعور اور اس کی نئی رسائیوں کے اس حق میں بھی ترجمان ہیں کہ غالب کو ان کی خوبیوں کا احساس تھا۔

اپنے لوہارو کے ایک عزیز کو انھوں نے ایک بہت ہی دل چسپ اور نہایت اہم خط لکھا ہے اور اس میں اپنی زندگی کے واقعات کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے اور یہاں سے بات شروع کی ہے کہ:

"یہ تو عام قاعدہ ہے کہ دنیا کے گناہ گاروں کو اس دنیا میں
بلا کر سزا دی جاتی ہے مگر میرے معاملے میں کچھ الٹا ہوا
ہے کہ میں اس دنیا کا گناہ گار تھا اور اس دنیا میں بھیج کر
مجھے سزا دی گئی۔"

ان کے نزدیک ان کی پیدائش سے ان کی سزا کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا جو زمانہ انھوں نے گزارا وہ گویا روبکاری اور مقدمے کی سماعت کی مدت تھی۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوئی۔ اس کو انھوں نے حبسِ دوام کی سزا سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دلی شہر کو زنداں مقرر کیا گیا اور مجھے میری بیوی کی بیڑیوں کے ساتھ اس قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد بلادِ مشرق کا سفر اور رام پور جانے کا واقعہ ان کے نزدیک ایک قیدی کے فرار ہونے کی کوشش تھی اس لیے دو ہتھکڑیاں اسے اور پہنا دی گئیں۔ اس سے مراد ان دو بچوں کی ذمہ داری تھی جو نواب زین العابدین خاں عارف کی وفات کے بعد ان کی سرپرستی میں آ گئے تھے اور ایک بار وہ اس حالت میں بھی رام پور گئے تھے کہ دونوں بچے ان کے ساتھ تھے۔

اس زندگی کو انھوں نے ان الفاظ میں بڑی خوش مذاقی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ کر مع ہتھکڑیوں کے میں زنداں سے بھاگ نکلا۔ بالآخر مجھے رام پور سے پکڑ لائے اور اسی زاویۂ زنداں میں ڈال دیا۔ اب میں نے عہد کیا ہے کہ میں کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہیں رہی۔ پاؤں بیڑیوں سے فگار ہو گئے اور ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری ہو گئی۔ اب دیکھیے رہائی کا حکم کب آتا ہے۔

اس طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اپنے ذاتی خطوط اور مکتوبات میں کس کس طرح سے دل چسپ باتیں کی ہیں۔ اس سے ان کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے وہ ذہن پر بھی اور زمانے پر بھی جو بدل رہا ہے اور نے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ غالبؔ کی اپنی انفرادیت جس اسلوب کے ساتھ قائم ہوئی وہ ان کا اپنا اسلوب ہے اور اس کی تقلید یا پیروی آسان نہیں ہے۔

اکائی: ۲۲

غالبؔ کی طنز و ظرافت

غالبؔ کو حالیؔ نے حیوانِ ظریف کہا ہے اور انسان کی سب سے بڑی صفت ہی یہ ہے وہ حیوان ناطق ہونے کے ساتھ ساتھ حیوانِ ظریف بھی ہے۔ ظرافت انسانی طبیعت کا بہت ہی لطیف عنصر ہے اور زندگی میں جو ناہموار، ناموزوں اور نامناسب باتیں ہوتی ہیں ان کو ایک ذہین انسان محسوس کرتا ہے اور ان کی ناموزونیت اور بے تکے پن پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اظہار کبھی طنز کی صورت میں ہوتا ہے۔ کبھی مذاق کی صورت میں، کبھی لطیف اشاروں کی صورت میں۔

طنز و ظرافت میں عام گفتگو کے مقابلے میں موقع موقع پر زیادہ احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کہ اگر طنزیہ جملے ضرورت سے زیادہ تکلیف کا باعث بنے، تلخ اور ترش ہو جائیں یا بے محابا ان میں ثقالت روی موجود ہو تو پھر وہ طنز نہیں رہ جاتا، اعتراض بن جاتا ہے، تلخ گفتگو کے دائرے میں آ جاتا ہے یا پھر پھکڑ پن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

بازاری فقروں میں بھی دل چسپ باتیں ہو سکتی ہیں لیکن بازاری لوگ عام طور سے جملے کسنے، فقرے تراشنے اور طنز کرنے میں فرق و امتیاز نہیں برتتے بلکہ گھٹیا پن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اسی لیے طنز و ظرافت میں ذہانت، خوش طبعی، خوش ذوقی اور خوش مذاقی کا لحاظ بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ چیزیں فطرت کی دین ہوتی ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اپنی خاص بخشش کے طور پر یہ خوبیاں دے اور اچھی طبیعت سے آراستہ کر دے۔

خوش مذاق، خوش طبع اور خوش ذوق آدمی سوسائٹی کے لیے بہت مفید مطلب ہوتا ہے کہ وہ سماج کی برائیوں پر ہنستا ہے اور ہنس ہنس کر ان باتوں کا ذکر کرتا ہے تو یہ ذکر ناگوار نہیں ہوتا نہیں تو کوئی اپنی برائی سننا نہیں چاہتا اور اس کے اظہار سے شکر رنجیاں اور تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب کہ خوش مذاقی کے ساتھ اگر کوئی فقرہ سامنے آتا ہے تو وہ سماج میں معاشرے کے ذہنی ماحول میں ایک طرح کی خوش رنگی اور خوش آہنگی پیدا کرتا ہے۔

آدمی قہقہے بھی لگاتا ہے اور کھل کر ہنستا یا مسکراتا اچھا لگتا ہے۔ مگر دوسروں کے خلاف اگر قہقہے

لگائے جائیں اور مذاق کرنے کے انداز میں مذاق اڑانے کا پہلو آجائے تو یہی بات ناگواری کا باعث بنتی ہے اور طنز و ظرافت سے آگے بڑھ کر ہجو گوئی کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ یعنی طرح طرح سے عیب نکالنا اور بُرے سے بُرے انداز میں دوسروں کی بُرائیوں کو سامنے لانا ہے۔

ہم اردو شاعری میں طنز و ظرافت کی روایت کو غالبؔ تک آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس میں طرح طرح کے رنگ، رویے اور ذہنی رسائیاں شامل ہوتی نظر آتی ہیں۔ ایک پہلو شہر آشوب ہے جو اردو میں ایک قدیم روایت ہے اور جس میں مختلف لوگوں کے کردار پر بحث کی جاتی ہے اور اس کے دلچسپ پہلو سامنے لائے جاتے ہیں۔ مطلب صرف تعارف نہیں ہوتا بلکہ اس پر کوئی اعتراض یا معاشرے کے رویے پر اعتراض ہوتا ہے۔ مثلاً میر کے یہاں ایک لڑکے کا ذکر اس طور پر آیا ہے جو عطار کا لڑکا ہے۔

میرؔ کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اس میں میرؔ نے اپنے ساتھ مذاق کیا ہے اور سادہ کہہ کر مذاق کیا ہے اور عطار کے لونڈے کا کردار بھی ایک خاص پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ شعر بھی نان بائی کی دوکان اور اس کے طبقاتی پیشہ ورانہ پس منظر سے تعلق رکھتا ہے۔

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر

اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے

اس شعر میں پلیتھن نکل جانا محاورہ ہے یعنی بُرا حال ہو جانا اور ٹکی لگانا بھی اسی نسبت سے ایک دوسرا محاورہ ہے جس کے معنی بُرا حال کر دینا ہے۔ اس شعر میں شہر آشوب کا پہلو بھی موجود ہے اور شہری سطح پر جو ایک عام ذہنی فضا بنتی ہے اور محاوروں کو وجود بخشتی ہے وہ بھی اس میں شریک ہے اور اپنی مجبوری بھی، اپنے حالات کی ناسازگاری بھی۔ میرؔ ہی کا ایک اور شعر دیکھئے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اس میں مزاح کے ساتھ ایک خوب صورت طنز بھی ہے کہ شہر کا شہر ایک ہی رجحان کا شکار ہو گیا اور سب اس میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ اردو کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دل کچھ اس طرح لیے اس نے کہ ہر سو کوئی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

بعض لوگ فریب کھاتے رہے اور ان کو اندازہ نہ ہوا کہ انھیں فریب دیا جا رہا ہے اور ان کے دل و دماغ پر بے جا طور سے قبضہ کیا جا رہا ہے۔ ہماری عام سیاسی اور سماجی زندگی میں ایسے تجربے برابر ہوتے رہتے ہیں۔ اب غالبؔ کا یہ شعر دیکھیے تو تصویر کا ایک دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

چاہنے والوں کو یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ اس لائق ہیں کہ دوسروں کو چاہیں اور معشوقوں پر فدا ہوں، یہ تو مذاق معلوم ہوتا ہے کہ اتنے معمولی لوگ اور اتنی بڑی چاہت۔ عوام کے رویے ہوں یا خواص کے ان پر گفتگو میں اگر حسن مذاق اور تفریح طبع کا لطیف پہلو موجود ہے اور حقیقت حال کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے تو وہ طنز ہے جو لطف مزاح کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

بعض لوگ خواہ مخواہ دشمنی پر آمادہ رہتے ہیں۔ انھیں کسی سے محبت کے بجائے مخالفت کا تعلق رکھنے میں مزا آتا ہے۔ اسی پر یہ ایک طنز ہے کہ آپ ہم سے تعلق منقطع نہ کریں اور کچھ نہیں کر سکتے اور دشمنی کرنے ہی کو آپ کی طبیعت چاہتی ہے تو ہم برداشت کر لیں گے۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

غالبؔ کی یہ غزل جس کا شعر اوپر پیش کیا گیا ہے مختلف زاویوں سے ان کے طنز و مزاح اور لطف و ظرافت کو پیش کرتی ہے۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

جلوت محفل کو کہتے ہیں اور خلوت تنہائی کو۔ یہ ایسے موقع پر طنزیہ فقرہ ہو سکتا ہے جب کوئی کسی دوسرے کو اس طرح اپنے قریب لائے کہ اوروں کو اس پر اعتراض ہو اور دوسرے اسے موجب رسوائی بتاتے ہوں اور وہ معصوم بن جائے اور یہ اندازہ ہی نہ کر سکے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔ اسی غزل کے ساتھ یہ شعر ذہن میں رکھیے کہ غالبؔ کیا چاہتے ہیں اور کیوں چاہتے ہیں۔ ان کے ذہنی ماحول اور دوسروں کے درمیان کس طرح کی کشاکش ہے۔ یہاں شکوہ و شکایت ہی کا موقع ہے مگر اس کی تصویر کشی اور لفظی پیکر اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ اس میں ایک لطیف طنز آ گیا ہے۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی

یعنی کبھی تم یہ سوچتے بھی نہیں ہو کہ تم غیروں سے محبت کرتے ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہارے لیے بے چین و بے قرار رہتے ہیں۔ تمہارا انتظار کرتے ہیں اور تمہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ یہ تم سے دوستی نہیں تو کیا اپنے سے دشمنی ہے۔

دراصل طنز و مزاح میں لب و لہجہ ہی بات کا رخ پلٹتا ہے اور اس میں نئے معنی اور نئی معنویت پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اردو کے کسی شاعر کا شعر ہے۔

آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں
اور ہیں اور، اور کچھ بھی نہیں

یہی لب و لہجہ اس شعر میں ملتا ہے۔

تم ہی تم ہو، تو کیا تم ہی ہو

ہم ہی ہم ہیں، تو کیا ہم ہی ہم ہیں

اب یہاں لب ولہجہ بدل دیجیے تو بات انکار سے اقرار میں بدل جاتی ہے اور اقرار پھر انکار کی طرف آجاتا ہے۔

غالب کے زمانے میں اور غالب سے پہلے اور بہت پہلے سے طنز ومزاح کا ایک خاص پہلو اس طبقے کے لوگوں کا مذاق کرنا اور مذاق اڑانا رہا ہے جو اپنے آپ کو بہت دین دار، پاک صاف، نیک اور بھلا تصور کرتے ہیں اور دوسرے کو کسی نہ کسی اعتبار سے گیا گزرا قرار دیتے ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر ہے۔

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

بظاہر واعظ دین داری کی تبلیغ کرتا ہے، شریعت کا پابند ہے اور جس سے نیکیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ کون سوچ سکتا ہے کہ وہ شراب خانے میں جا کر بیٹھا ہوگا مگر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ہم مے خانے سے نکل رہے تھے اور وہ وہاں جا رہا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب واعظ بھی کام وہی کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔

واعظ سے چھیڑ چھاڑ بہت شعراء کے یہاں مل جاتی ہے۔ کبھی اس کا کردار ایک زاہد اور کبھی واعظ اور کبھی متقی اور پرہیزگار آدمی پر پھبتیاں کسنے کی نوبت آتی ہے۔ مثلاً

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اے واعظ تم شراب طہور کا ذکر تو کرتے ہو، بار بار کرتے ہو لیکن نہ تم نے خود پی، نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ اب اس شراب طہور کا کوئی کیا کرے۔ کیا بات ہے کہہ کر غالب نے اس میں بہت لطیف اور معنی خیز فقرہ کہا ہے اور اس سے زبان کے ان پہلوؤں اور تہ داریوں کا پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اہل زبان کس طرح اپنے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ ان کا ایک اور شعر ہے۔ وہ بھی واعظ سے متعلق ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اس طرح کے شعر صرف شعر نہیں ہیں بلکہ طنز و مزاح کے لطیف اور خوب صورت نمونے بھی ہیں۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

اب لاگ اور لگاؤ ٹھیٹھ اردو کے لفظ ہیں۔ مگر غالبؔ نے انھیں سیدھے سادے لفظوں سے بڑے لطیف اور طنز آمیز معنی پیدا کیے ہیں کہ جب آپ ہم سے لاگ اور لگاؤ کچھ بھی نہیں رکھتے تو اب ہم کس بات پر اپنے آپ کو دھوکہ دیں اور اپنے دل کو بہلائیں۔

غالبؔ کے لطیف اشاروں میں ذہن سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

میں نے یہ کہا کہ تمھاری بزمِ ناز میں غیر کو تو نہ ہونا چاہیے، اس نے مجھے ہی محفل سے اٹھا دیا کہ اس کے نزدیک میں ہی غیر تھا۔

عشق کی نفسیات کتنی پیچیدہ اور ریشم کے تاروں کی طرح الجھی ہوئی ہوتی ہے اور کون آدمی کس بات کا مطلب کیا لیتا ہے۔ اس کا اندازہ اس شعر سے بھی ہوتا ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر کہا تھا اور یہ چاہا تھا کہ اس سے میرے محبوب کی بزمِ ناز خالی ہو جائے۔ اب یہ میرے معشوق کی ستم گری ہی تھی کہ مجھے ہی غیر سمجھ رہا تھا اور جب اس نے مجھے ہی اٹھا دیا تو اس کا احساس ہوا کہ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اور ہم کچھ اور سوچ رہے تھے۔

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

یہاں بات کچھ اور آگے آ گئی اور ستم گری کی منطق ستم میں بدل گئی کہ میرے رقیب نے تیری محفل

سے اٹھا دیا اور میں اٹھ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ دیکھا کہ رقیب جو کچھ کر رہا ہے وہ تیرے اشارے پر ہو رہا ہے۔ اس میں طنز کا جو پہلو چھپا ہوا ہے اس نے اس شعر میں زیادہ تہہ داری بلکہ نشتریت پیدا کر دی ہے۔

غالبؔ کے مزاح و ظرافت کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ اور لائقِ تحسین ہے کہ وہ بات کو اپنے اوپر ڈھال کر کہتے ہیں اور اس طرح سامنے لاتے ہیں جیسے وہ اپنا ہی مذاق اڑا رہے ہوں۔ جب کہ مذاق اڑانا یا مذاق کرنا دوسروں سے مقصود ہوتا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

دراصل یہ شعر ذوق کے لیے کہا گیا ہے جو بادشاہ کے بہت منہ چڑھے تھے اور شہر میں ان کی بہت مانگ تانگ تھی۔ اسی لیے تو غالبؔ نے اتراتے پھرنا کہا ہے اور پھر وہاں اپنے آپ کو فٹ کر دیا اور ساری بات اپنے اوپر لے لی۔ یہ غالبؔ کے طنز و مزاح کا ایک نہایت دلچسپ نمونہ ہے اور جس سے ان کی خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کبھی کبھار سنجیدہ موڈ میں شعر کہتے ہیں۔ مگر اس سے لطفِ مزاح کے خوش نما پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
خود ہماری خبر نہیں آتی

یا اسی غزل کا یہ دوسرا شعر۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہمارا عام سماجی رویہ یہ ہے کہ ساری ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا چاہتے ہیں اور کسی نہ کسی بات کا سہارا لے کر اپنی جان بچانے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ ہے کہ کسی سے ہمدردی کرنا نہیں چاہتے۔ اس کی مشکلات اور تکلیفوں کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتے مگر الزام اس پر رکھتے ہیں کہ آپ نے ہم سے کہا ہی نہیں۔ اسی کی طرف تو غالب نے اشارہ کیا ہے کہ اگر میں نے اپنی زبان سے نہیں کہا تو کیا وہ صورت حال موجود نہیں تھی جس سے تم اسے سمجھ جاتے۔ یہاں لفظیات شگفتہ نہیں ہیں جو غالبؔ کے طنز و مزاح میں عام طور پر موجود ہوتے ہیں اور یہ

بھی ان کی ایک بڑی خوبی ہے اور ان کے مزاج کی بھی۔

یہ شعر بھی اپنے کو درمیان میں رکھ کر طنز و مزاح کی راہ اختیار کرنے کی ایک اچھی مثال کہی جا سکتی ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

تماشا یہاں طنز و مزاح کے لحاظ سے ایک بہت معنی خیز لفظ ہے۔ غالبؔ کے ایک اور شعر میں بھی ہم ان کے فکر و خیال کی اس تماشا گری کو دیکھ سکتے ہیں۔

ذبح کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور وہ گلہ بھی کرتے ہیں تو اس میں بھی ایک طنز چھپا ہوتا ہے۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

یعنی اب ہم کس سے اپنی قسمت کی شکایت کریں جب تو نے خنجر آزمائی سے بھی انکار کر دیا۔ یعنی مہربانی تو کیا ظلم کرنے سے بھی تم میرے معاملے میں باز رہنا چاہتے ہو۔ بظاہر تو یہ دوستی ہے مگر حقیقت میں بیزاری ہے۔ ہم اسے حکیمانہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس میں طنز و مزاح کا جو پہلو موجود ہے اس کا لطف الگ ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہاں سماج کی ناانصافی اور جانب داری پر کھلے بندوں طنز کیا گیا ہے اور بلاوجہ نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کا تجربہ ہے کہ سماج کے فیصلوں میں کتنی ناانصافیاں اور نابرابری کے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اب ان پر کھلے بندوں بھی کچھ کہا جا سکتا ہے اور طنز و ظرافت کے لطیف پہلوؤں کے ساتھ بھی۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تیری عادت ہی سہی

ہم بھی تیرے ہی جیسا رویہ اختیار کریں گے اگرچہ تسلیم و رضا کے اعتبار سے ہوگا۔ تیری بے نیازی کے طور پر نہیں۔

غالبؔ کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ

کوئی ہم کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

اب حضرت ناصح کا کردار خود ہی ایک ایسا کردار ہے جس پر شاعرانہ اعتبار سے طنز و مزاح کے تقاضے موجود ہیں۔ اس پر وہ تشریف لا رہے ہیں تو آخر کیا کہیں گے۔ ہمیں کیا سمجھائیں گے۔

اب اس کے مقابلے میں یہ دوسرا شعر ملاحظہ ہو جو اس کا جواب معلوم ہوتا ہے۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک

ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یعنی جان کر انجان بنا آپ کی تو عادت ہی، اب ہم اپنے دل کا حال بھی آپ کے آگے رکھیں گے تو پھر وہی بے تعلق اور ناداں بن کر کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں سمجھے۔

غرض کہ غالبؔ کے یہاں طنز و مزاح کے مختلف شیڈ (Shade)، پرتو اور پرچھائیاں ملتی ہیں جس میں ان کی طبعی ظرافت کو بھی دخل ہے۔ فکر کی شوخیوں کو بھی اور اس ذہانت کو بھی جس کے ساتھ انھوں نے اپنی ذاتی اور سماجی زندگی پر نظر ڈالی۔

اکائی: ۲۳

غالبؔ اور ان کے معاصرین

غالبؔ ایک بڑے عہد میں پیدا ہوئے۔ یہ سیاسی اعتبار سے اس معنی میں غیر معمولی عہد تھا کہ انگریز کمپنی بہادر کا قبضہ ہندوستان کے طول و عرض پر ہو چکا تھا۔ صرف پنجاب کا علاقہ باقی تھا جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ ابھی غالبؔ حیات تھے کہ ۱۸۴۹ء میں وہ بھی ختم ہو گئی اور اس پورے ملک پر انگریز کمپنی بہادر کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس سے ایک نیا نظام آ گیا۔ ایک نئی قوم کی حکومت آ گئی اور ہمارے معاشرے میں نئی طرح کے لوگ پیدا ہو گئے۔ یہی غالبؔ کے معاصرین ہیں۔

غالبؔ کے معاصرین کو ہم تین دائروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کے زمانے کے ممتاز شاعر اور ادیب یعنی ایسے مایۂ ناز اشخاص جن کی وجہ سے غالبؔ کے دور کو ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ حالی نے لکھا ہے کہ:

> ''تیرھویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا تنزل اپنی
> انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ ان کے
> علوم و فنون بھی رخصت ہو چکے تھے۔ حسنِ اتفاق سے شہر
> دہلی میں کچھ ایسے با کمال اکٹھے ہو گئے تھے جن کے
> جلسوں اور محفلوں کو دیکھ کر عہدِ اکبری و شاہجہانی کے جلسے
> یاد آتے تھے۔''

غالبؔ نے خود بھی اس ضمن میں اپنے بعض ممتاز دوستوں کے نام ایک قطعے میں نظم کیے ہیں ان میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، مولوی مفتی صدر الدین آزردہؔ، مولوی امام

بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومنؔ اور حکیم محمود خاں جو خاندان شریفی کے ایک ممتاز طبیب تھے، مہاراجہ پٹیالہ کے طبیب خاص تھے اور غالبؔ انھیں کے مکانوں میں سے ایک مکان میں رہتے تھے۔ علی بخش خاں رنجور جو غالبؔ کے برادرِ نسبتی تھے یعنی ان کی بیگم کے بھائی اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بیٹے۔ اسی طرح نواب زین العابدین خاں عارف جو بیگم غالبؔ کے بھانجے تھے اور غالبؔ انھیں خاندانی رشتوں کی وجہ سے بہت محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں انھیں کے بیٹے تھے جو عارف کی وفات کے بعد غالبؔ ہی کی سرپرستی میں آگئے تھے۔

یہ سب لوگ اور ان کے ماسوا اس وقت کی دہلی کے بہت سے شاعر و ادیب غالبؔ کے معاصرین میں شمار ہو سکتے ہیں جو عمر میں ان سے چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ برابر والے بھی رہے ہوں گے اور نسبتاً جونیر بھی۔ مثلاً ہم بہادر شاہ ظفرؔ اور ان کے اہلِ دربار کو غالبؔ کے ایسے معاصرین میں شامل کر سکتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفرؔ ان سے بڑے بھی تھے اور بہت حد تک ان کے سرپرست بھی۔ اس لیے کہ غالبؔ کے بہت سے فارسی قصیدے بہادر شاہ ظفرؔ ہی کی مدح میں ہیں۔

اس وقت شاہی دربار کی حالت بہت شکستہ ہو گئی تھی اور مغل خاندان کی حکومت ان تک پہنچتے پہنچتے قلعۂ معلی کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دادا شاہ عالم ثانی غلام قادر روہیلے کے ہاتھوں نابینا بھی ہو چکے تھے۔ مرہٹوں کے کافی زمانے تک زیرِ اثر رہے اور ان کو ذاتی اخراجات کے لیے چھ ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا تو شاہ عالم ثانی انگریز کمپنی بہادر کی حکومت میں کچھ اس طرح آگئے کہ بادشاہ وہی رہے لیکن اقتدار تمام تر کمپنی بہادر اور اس کے حکام اور عمال یعنی افسروں کے ہاتھ میں رہا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں ان کی وفات ہو گئی تو ان کے بیٹے اکبر شاہ ثانی قلعۂ معلی میں مسند نشین ہوئے اور سنہ ۱۸۳۷ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ قلعۂ معلی کے شہنشاہ بنائے گئے۔ یہ کارخانہ بھی سنہ ۱۸۵۷ء میں درہم برہم ہو گیا۔

غالبؔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے قلعۂ معلی میں جاتے تھے لیکن ان کا خاص تعلق بہادر شاہ ظفرؔ ہی سے تھا جو اس وقت ولی عہد تھے اور شہزادہ ولی عہد کہلاتے تھے۔ عالمِ شہزادگی میں کم اور ظفرؔ کی بادشاہت کے دوران غالبؔ نے بہت قصیدے ان کے لیے لکھے۔ ان میں سے دو اردو میں ہیں اور بہت اچھے قصیدے ہیں اور باقی سب

فارسی میں ہیں۔ غالبؔ کے فارسی قصیدہ نگاری کی بہترین مثالیں ان کے منظوم قصائد کے بعد بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں کہے جانے والے قصائد ہی میں ملتی ہیں۔

ان کے لیے کہے گئے بعض قصائد وہ بھی ہیں جو نام اور اشعار بدل کر دوسروں سے منسوب کر دیے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کے اپنے ولی عہد شہزادہ مرزا فخرو تھے۔ یہ غالبؔ کے ایک طرح پر مالی سرپرست بھی تھے کہ ان کے دربار سے غالبؔ کا چار سو روپیہ سال وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ خود بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کو پچاس روپے ماہوار ملتے تھے جو صرف سات برس تک ملے، اس لیے کہ انھیں بادشاہ کی طرف سے یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ وہ اپنے خاص انداز میں مغل خاندان کی تاریخ لکھ دیں جس کا مواد حکیم احسن اللہ خاں تاریخی کتابوں سے جمع کر کے ان کو دیتے تھے۔ ہم حکیم صاحب کو بھی غالبؔ کا معاصر تصور کر سکتے ہیں اگرچہ ان سے کچھ زیادہ روابط نہیں تھے لیکن نگارشِ تاریخ کے سلسلے میں یہ بہت اہم بات تھی۔

ذوقؔ جن کا نام شیخ ابراہیم محمد تھا ایک اردو شاعر کی حیثیت سے غالبؔ کے بہت ممتاز معاصرین میں سے تھے۔ یہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی تھے اور ان کی وفات کے بعد ظفر نے غالبؔ کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ چوں کہ بہادر شاہ ظفر، ذوقؔ پر بہت مہربان تھے اور دربار میں ان کی قدر و منزلت بہت ہوتی تھی، اس لیے غالبؔ، ذوقؔ سے ایک گونہ معاصرانہ چشمک رکھتے تھے اور ان پر چوٹیں کستے رہتے تھے۔ اسی لیے یہ شعر بھی سامنے آیا جو غالبؔ کے خاصے مشہور شعروں میں سے ہے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

ان کا یہ بہت معروف شعر بھی ذوقؔ ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالبؔ کے دوستوں میں مفتی صدرالدین جو آزردہ تخلص رکھتے تھے ایک تذکرے کے بھی مصنف ہیں، اردو، فارسی اور عربی پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ سرسید

نے ''آثار الصنادید'' میں ان کا بہت عزت و احترام کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جو صدر الصدور بھی تھے اور مشاعروں میں بھی گاہ گاہ شرکت فرماتے تھے۔

مفتی صاحب کے علاوہ مولوی فضل حق خیر آبادی دہلی ہی میں رہتے تھے۔ مولانا فضل امام کے بیٹے تھے۔ باپ اور بیٹے دونوں اپنے وقت کے بڑے عالم اور فاضل شخص تھے۔ شاہی دربار سے بھی مولانا فضل حق کا تعلق تھا مگر بہ حیثیت شاعر نہیں، وہ شہزادۂ ولی عہد ابوظفر کے دربار میں بھی آتے جاتے تھے۔ غالب ان سے بہت تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کی بڑی دلداری کرتے تھے۔ جب مولوی فضل حق خیر آبادی نواب عبدالرحمٰن خاں رئیس جھجر کی قدر دانی اور فرمائش پر دہلی سے جھجر جا رہے تھے اور دہلی چھوڑ رہے تھے تو شہزادے سے ملنے گئے۔ غالب بھی وہاں ہوں گے۔ انھوں نے اپنے ایک فارسی خط میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے اور مولوی سراج الدین احمد کو کلکتہ لکھ کر بھیجا ہے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں مولانا بھی انگریزوں کے معتوب ہوئے اور گرفتار کرکے کالے پانی بھیج دیے گئے اور وہیں مولانا کا انتقال بھی ہوا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر فارسی میں اپنا تخلص ''رخشاں'' رکھتے تھے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے دہلی کے بہت معزز اور محترم امیر زادے تھے۔ بیگم غالب کے برادر عم زاد تھے اور لوہارو خاندان سے نسبت کی وجہ سے اہلِ دہلی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ غالب کے دوست بھی تھے اور شاگرد بھی۔ غالب نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ان کا کلام بھی ان کے پاس نہیں رہا۔ حسین مرزا اور ضیاء الدین احمد خاں جو یہ لکھتے تھے، اس کو جمع کر لیتے تھے۔ لوہارو خاندان کی طرف سے غالب کو وقتاً فوقتاً مالی اعتبار سے جو قدر و منزلت ہوتی تھی اس میں ضیاء الدین احمد خاں خاص طور پر شریک رہتے ہوں گے۔ نواب امین الدین احمد خاں انھیں کے بڑے بھائی تھے اور غالب کے دوستوں میں تھے۔

نواب علاء الدین احمد خاں علائی، نواب ضیاء الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن سے غالب کی خط و کتابت بھی تھی۔

غالب کا مشہور خط جو انھوں نے اپنی زندگی کی روداد کے طور پر لکھا ہے اور بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ وہ علاؤ الدین علائی کے نام ہے۔ یہ غالب سے عمر میں چھوٹے ہیں لیکن غالب ان سے بےتکلفانہ اور عزیزانہ

رشتہ رکھتے ہیں اور بے تکلف ہیں جس کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

اس زمانے کے بعض بڑے اہلِ علم بھی غالبؔ کے معاصرین میں گنے جاتے تھے۔ اس کی طرف اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس زمانے کے دوسرے اہلِ علم کو اگر ہم شامل نہ کریں تب بھی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے خاندان کے علماء غالبؔ کے معاصرین میں ہیں۔ ان میں شاہ عبدالعزیز خود بھی ہیں جو غالبؔ سے بہت بڑے ہیں اور اس معنی میں ان کو معاصرین میں نہیں شریکِ عصر لوگوں میں کہا جا سکتا ہے۔ اس خاندان نے علم و فن کے ساتھ اُردو زبان کی بھی بڑی خدمت کی ہے اور اس دور میں قرآن پاک کے جو ترجمے اُردو میں ہوئے وہ اسی خاندان کے علماء کی یادگار ہیں۔ ان ترجموں سے بعد کے ترجمے کرنے والوں نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔

شاہ عبدالعزیز اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن اس زمانے کے ادیب اور شاعر بغرضِ اصلاح ان کو کبھی کبھی اپنا کلام دکھاتے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ بھی ان سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ ذوقؔ کا ایک قصیدہ جس میں ۱۸ شعر ۱۸ مختلف زبانوں میں تھے بہادر شاہ ظفرؔ نے حضرت شاہ عبدالعزیز کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اس کے ادبی معیار کو جانچ لیں اور بادشاہ کو اس سے آگاہ کریں۔ اس کے علاوہ قدیم دلی کالج اس وقت نہ صرف قائم ہو چکا تھا بلکہ اس سے بعض بہت اہم اشخاص بھی وابستہ تھے۔ مولانا مملوک العلی کا ذکر اس سے پہلے آ چکا تھا۔ وہ قدیم دلی کالج ہی کے عربی کے مدرس تھے۔ مسٹر ٹامسن جو اس کالج کے سیکرٹری تھے، ان کے لیے غالبؔ نے ایک سے زیادہ موقعوں پر قصیدے لکھے ہیں۔ اسی کالج سے مولوی کریم الدین بھی وابستہ تھے جو پانی پت کے رہنے والے تھے۔ انھیں اُردو شعر و ادب سے بھی بہت دلچسپی تھی اور دلی کا ایک بڑا یادگار مشاعرہ انھیں کی کوشش سے منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے تذکرے "طبقاتِ شعرائے ہند" میں ان شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ یہ وہی تاریخی مشاعرہ ہے جس کا تذکرہ الگ سے کتابی صورت میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دلی کالج کا آخری یادگار مشاعرہ" کے نام سے مرتب کیا ہے جو فرحت اللہ بیگ کا بہت معروف ادبی کارنامہ ہے۔

مولوی کریم الدین سے غالبؔ کے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ ان کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا مگر یہ اس وقت کے اہم اشخاص میں سے تھے۔ انھوں نے تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی کا ترجمہ کیا تھا جو مشہور فرانسیسی مصنف گارساں دتاسی کی کتاب تھی۔ یہ ترجمہ انھوں نے مسٹر فیلن کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ اس لیے کہ خود مولوی کریم

الدین غالباً فرانسیسی زبان نہیں جانتے تھے۔ مولوی کریم الدین نے دوسرے ادبی کام بھی دہلی کالج میں رہ کر کیے تھے۔

ماسٹر رام چندر بھی اسی کالج کے ایک طالب علم اور بعد ازاں استاد رہے تھے۔ اگرچہ وہ سائنس کے آدمی تھے مگر انھوں نے بہت سا کام اردو میں کیا اور اردو کے لیے کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو میں "محب ہند" اور "خیر خواہ ہند" کے نام سے انھوں نے ہی یکے بعد دیگرے دو رسالے جاری کیے جو اردو میں اس وقت نئی بات تھی۔ یہ رسالے زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکے۔ مگر ماسٹر رام چندر نے اپنا علمی اور ادبی کام جاری رکھا۔

مولانا محمد باقر، مولوی محمد حسین آزاد کے والد تھے اور پہلا اردو کا اخبار "دہلی اردو اخبار" کے نام سے انھوں نے ہی جاری کیا تھا۔ یہ ہفتہ وار نکلتا تھا اور اس میں قلعۂ معلی کی خبریں بھی ہوتی تھیں اور اس وقت کے حالات کے مطابق کچھ عالمی خبریں بھی۔ شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا۔ غالب کے اشعار یا کلام کے چھپنے کی نوبت بھی آتی چاہیے مگر غالب نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد جب غالب کی پنشن بند ہو گئی اور ان پر یہ الزام لگا کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ اس سلسلے میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اپنے کئی خطوں میں یہ بات لکھی کہ وہ قطعہ ذوق نے کہا تھا اور انھیں کے نام سے وہ چھپا بھی تھا۔

ذوق ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں زندہ نہیں تھے۔ ان کا انتقال اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ قطعہ ذوق نے یا غالب نے ممکن ہے بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقع پر اس وقت کہا ہو گا جب وہ اپنے والد کی وفات پر ۱۸۳۷ء میں قلعۂ معلی کے مسند نشین ہوئے ہوں گے۔

بہر حال غالب نے اپنے خطوں میں اس صورتِ حال پر ذکر کیا ہے اور مولانا محمد باقر کے اخبار کی تلاش کا تذکرہ ان کی زبان پر آیا ہے۔ مولانا محمد باقر کی غالب عزت کرتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے دہلی کے جن لوگوں کو مجرم ٹھہرا کر موت کی سزا دی تھی، ان میں مولوی محمد باقر بھی تھے۔ غالب نے جن کا ذکر کیا ہے اور ان کی موت پر اظہار افسوس کیا ہے۔

مولوی امام بخش صہبائی غالب کے ایک گونہ دوستوں میں بھی تھے اور ان کے ممتاز معاصر بھی تھے۔ ان کا شمار دہلی کے پڑھے لکھے استادوں میں ہوتا تھا۔ حالی کی روایت کے مطابق غالب کے قدیم دہلی کالج کے

مدرس مقرر ہونے سے انکار کی صورت میں مولوی امام بخش صہبائی اس جگہ پر مقرر کیے گئے تھے اور ایک سو روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر رکھی گئی تھی جو اس زمانے کے اعتبار سے بڑی تنخواہ تھی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں تو اہل علم کو بھی بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔

امام بخش صہبائی فارسی زبان کے بڑے ماہر خیال کیے جاتے تھے۔ خان آرزو اور شیخ علی حزیں کے مابین زبان کے مسئلے پر جو نزاع تھا اس میں اپنے زمانے میں مولوی امام بخش صہبائی نے بھی حصہ لیا تھا اور اس پر قول فیصل کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔

مرزا محمد حسین تبریزی کی معروف کتاب "برہان قاطع" کے جواب میں غالب نے "قاطع برہان" کے نام سے جو ایک رسالہ ترتیب دیا تھا اور اس پر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس میں صہبائی کے ایک شاگرد نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس وقت غالب نے صہبائی کے بارے میں جو رائے دی تھی وہ اچھی نہیں تھی لیکن غالب نے جب مولانا صہبائی کو انگریزوں نے بجرم غدر کے ہنگامہ کے طور پر سزا دی تو اس پر اظہار افسوس کیا اور مولانا آزردہ کا یہ شعر بھی کہیں غالب کی زبان پر آیا۔

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جب صہبائی ہو

غالب کے معاصرین میں تو نہیں لیکن بے تکلف دوستوں اور شاگردوں میں مولانا حالی بھی تھے، میر سرفراز حسین بھی، میر مہدی مجروح بھی۔

حالی نے غالب سے باقاعدہ اصلاح لی ہو یا نہ لی ہو لیکن ان کا بیان ہے کہ انھوں نے مرزا کے بعض قصیدے بھی ان سے پڑھے تھے اور اپنی کچھ غزلیں بھی ان کو دکھائی تھیں مگر حالی، مرزا کے گروہی سمجھے جاتے ہیں اور مرزا کی سوانح اور سیرت پر سب سے پہلی کتاب انھوں نے ہی لکھی۔ اس معنی میں حالی، غالب کے معاصر بھی ہیں، ان کے دوست بھی اور شاگرد بھی۔

میر مہدی مجروح کے نام غالب کے بہت سے خطوط ہیں اور بہت بے تکلفانہ خط ہیں۔
ویسے میر مہدی مجروح سے غالب کا رشتہ استادانہ اور بزرگانہ تھا مگر جس انداز سے غالب ان کو مخاطب کرتے تھے وہ

رویہ دوستانہ تعلقات کی نشاندہی کرتا ہے۔

انگریزوں میں بھی بعض انگریز وہ تھے جو غالبؔ کے دوستوں میں سے تھے اور ان کے ہمدرد تھے۔ باعتبار فن کار ان کی قدر کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک انگریز مسٹر انڈریو سٹرلنگ بھی تھے جن سے غالبؔ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ غالبؔ اپنے معاملات میں اسٹرلنگ سے مدد و معاونت کی بہت کچھ توقعات رکھتے تھے۔ ان سے کلکتہ میں غالبؔ کی ملاقات ہوئی تھی اور کلکتہ سے غالبؔ کے دہلی واپس آجانے کے بہت بعد اس انگریز افسر کی وفات ہو گئی۔ کلکتہ میں غالبؔ کے اور بھی دوست تھے۔ ان میں خاص طور پر مولوی سراج الدین احمد بھی تھے۔ اور کچھ لوگ ہیں جنھیں غالب کے معاصرین۔ احباب۔ اعزا اور تلامذہ بھی شامل ہیں۔ غالبؔ ان کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کی تعریف بھی۔ یہ لوگ عالم بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، اپنے وقت کے بڑے رئیس بھی ہیں اور ان میں بعض وہ بھی ہیں جو غالبؔ کے شاگرد ہیں۔ ان میں ایک صاحب مرزا ان جان جاکوب بھی ہیں جن کا ذکر غالبؔ نے بہت بار اپنے خطوں میں کیا اور جن کے نام غالبؔ کے خط بھی ملتے ہیں۔

خطوطِ غالب

(۱)

میاں!

آج یک شنبے کا دن، ساتویں فروری کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی، دریبے والے استاد حامد کے کوچے کے، میرے پاس آئے اور انھوں نے تمھارا خط لکھا ہوا پندرہ جمادی الثانی کا دیا۔ ڈاک کا خط ہرگز مجھ تک نہیں پہنچا اور نہ میں شہر سے کہیں گیا۔ جہاں رہتا تھا وہیں ہوں۔ خدا جانے وہ خط مسترد کیوں ہوا؟ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارا خط آوے اور میں پھیر دوں؟ تم خود کہتے ہو کہ اس پر یہ لکھا ہوا آیا کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ میں ہوتا اور یہ لکھتا کہ میں نہیں ہوں؟ آگرے اور الور اور کول سے برابر خط چلے آتے ہیں۔

تمھارے والدہ کا مرنا اس کو مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے۔ اور اس ضعیفہ کو بخشے۔ میرا شفیق بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔

کیا افسوس اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ "آیا چاہتا ہوں۔" اگر آؤ گے تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔ میر احمد علی صاحب کو لکھتے ہو کہ "یہاں ہیں" مجھ کو نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ مجھ کو لکھتے تو اچھا کرتے۔ میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ حکام جانتے ہیں کہ یہ یہاں ہے۔ فکر نہ کریں۔ باز پرس و گیر و دار میں آیا ہوں نہ خود وقت اپنی طرف سے قصد ملاقات کا کیا ہے۔ ہم اس میں بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہے؟

نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو۔ وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں، بھیجنا ممکن نہیں۔ جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لو گے۔

کمبخت چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا، اب شہر میں آ گیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بیرام پور، میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

میرن صاحب کی خیر و عافیت معلوم ہوئی مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ وہاں مع قبائل ہیں یا تنہا ہیں۔ اگر تنہا ہیں تو قبائل کہاں ہیں؟ تمھارے چھوٹے بھائی کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں اور اچھی طرح ہیں۔

بڑے بھائی کا حال کیوں نہ لکھا؟ یقین ہے کہ وہ اور تم یک جا ہو۔ گو ان کو ربط مجھ سے زیادہ نہیں۔ لیکن فرزند ہونے میں تم اور وہ برابر ہو۔ خط بھیجنے میں تردد اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔ زیادہ زیادہ۔

یکشنبہ، ہفتم فروری ۱۸۵۸ء وقت رسیدن نامہ — غالب

(۲)

صاحب!

دو خط تمھارے بے ٹکٹ ڈاک آئے۔ دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمھارا خط دیا، صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے، ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا: "اشرف علی"۔ قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا، حکیم نکلے، یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔

لکھتے ہو "مصطلحات الشعرا" بھائی! وہ کتاب تمھاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا بھیج دوں گا۔ تقاضا کیوں کرو۔ میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جلدی نہ کرو۔ دیر آید درست آید۔ سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا کہیں۔

صبح چہارشنبہ ہفتم رمضان ۱۲۷۴ھ ،

۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

کیوں یار، کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیے گا نہیں، میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی! اچھی حکمت کی۔ کیا وہ میرے بابا کے نوکر تھے کہ میں اُن کو بلاتا؟ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے۔ ادھر کی بات، اُدھر کی بات۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھوایا۔ اجی کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے؟ صاحب! میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا اُن کو پتا لکھا ہے کہ وہاں ٹھیر کر مجھ کو اطلاع کرو۔ میں شہر میں بلا لوں گا۔ صاحب! اب وہ ضرور آئیں گے۔ آخر کار اُن سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں کہ اُن سے مختصر یہ کہہ دو کہ بھائی، یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو، یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔

یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا، آیندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کی ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟

میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ یہ خط پڑھا دو اور اِدھر کو روانہ کرو۔

کیا خوب بات یاد آئی ہے۔ کیوں وہ شہر سے باہر ٹھیریں اور کیوں کسی کے

بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر اتر پڑیں۔ مرزا قربان بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان ہے، ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو عید بھی یہیں کریں۔

اپریل ۱۸۵۸ء

(۴)

خوبی دین و دنیا روزی باد۔ میر اشرف علی صاحب نے تمھارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا کہ "میرا خط میرے ہم نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا۔" صاحب! قصور تمھارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔ فقط۔

پنسن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔ کل منگل کا دن، ساتویں اگست کی، مجھ کو اجنٹ صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ کل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے، تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آیندہ کی مقرر ہوتی ہے۔

غلام فخرالدین خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے۔ خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرہ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تاکہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔ ہاں صاحب! میر اشرف علی صاحب بھی یہی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین پانی پت آیا چاہتے ہیں، اگر آ جائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

یکشنبہ ۱۸ اگست ۱۸۵۸ء

(۵)

بھائی!

تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا میں نے سنا تھا، وہ البتہ موجب تشویش تھا۔ تمھاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہوگئی۔ پھر تم کیوں ہائے واویلا کرتے ہو؟ اوپر کا حاکم موافق ہے۔ ماتحت کا حاکم، جو مخالف تھا، سو گیا، پھر کیا قصہ ہے؟

''قاطع برہان'' کے مسودے میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہوگئی۔ ہاں، اس کی نقلیں صاف، کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کرلی ہیں۔ ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خاں کے واسطے میری ملک کی جو کتاب ہے اس کی جلد بندھ جائے تو بہ طریق مستعار تم کو بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا، اور یہ امر بعد محرم واقع ہوگا مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف ''برہان قاطع'' کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو۔ اساتذۂ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہوا اور کچھ یاد بھی ہو، چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

''فہمائش'' کا لفظ میاں بڈھا ولد میاں ٹھٹا اور لالہ گنپتی داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زبان سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو۔ امر کے صیغے کے آگے ''شین'' آتا ہے، تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو ''حاصل بالمصدر'' کہتے ہیں۔ ''سوختن'' مصدر ''سوزد'' مضارع ''سوز'' امر ''سوزش'' حاصل بالمصدر، اسی طرح ہیں۔ ''خواہش'' و ''کاہش'' و ''گزارش'' و ''گذارش'' و ''آرائش'' و ''پیرائش'' و

''فرمایش''، ''فہمیدن'' فارسی الاصل نہیں ہے۔ مصدر جعلی ہے۔ ''فہم'' لفظ عربی الاصل ہے۔ ''طلب'' لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافق قاعدہ فرس ''فہمیدن''، ''طلبیدن'' کر لیا ہے اور اس قاعدے میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصلی عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ ''فہم'' یعنی ''بفہم'' ''سمجھ''، ''طلب'' یعنی ''بطلب''، ''مانگ''، ''فہمد'' مضارع بنا ''طلبد'' مضارع بنا۔ خیر یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنائیں؟ سنو، حاصل بالمصدر ''فہمش'' اور ''طلبش'' ہونا چاہیے۔ ''فہم'' تھا۔ صیغۂ امر فہمد سے نکلا تھا۔ ''الف'' اور ''ے'' کہاں سے آیا؟ ''فہمائی'' تو نہیں ہے۔ جو فہمایش ''درست'' ہو۔ کہیں ''فرمایش'' کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا۔ وہ مصدر اصلی فارسی ''فرمودن'' ہے۔ ''فرماید'' مضارع، ''فرمائے'' امر، حاصل مصدر ''فرمایش''۔

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد دیجیو۔ میں نے رات کو اپنے عالم سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا۔ میر کاظم دین کے بارہ سو چھتر ہوتے ہیں لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ ''فہمایش'' ٹکسال سے باہر ہے۔

اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۲)

میاں!

تم کو فسخ کی کیا جلدی ہے؟ بار بار فسخ کو کیوں پوچھتے ہو؟ فسخ جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھوں کیا حکم ہو اور کب ہو؟

میرن صاحب جے پور پہنچے۔ تم شاہ پوری بتاتے ہو، شاید یہی ٹھیک ہو۔ ہاں! میر محمود علی اور یہ میر یار اور ابوالفضل تو تھے، مگر دیکھا چاہیے، درخت جگہ سے اکھڑ کر بے دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں

کیا تھا کہ جمع ہوں گے۔ سنی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔

میر سرفراز حسین کو دعا۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دعا۔ کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمھارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا، تب ایک کتاب تم کو دوں گا۔

روز ورود نامہ شنبہ ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء　　　　　　　　از غالب

(۷)

سید صاحب!

تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو دیے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں، ڈھائی سو کیسے؟ سبحان اللہ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے۔ آبرو بچی، جان بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ اور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔

پنسن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ مجھے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال، اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنسن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم ہے، نہ کسی کو خبر۔

میاں! کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لایا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا،

اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔

حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ ان پچاس جلد میں سے شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرما چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔

بھائی! میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا۔ ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے، اگر ختم کر کر مسودہ ان کے سامنے آگرے نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟

اہل خطہ کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیوں کر معلوم ہو۔ سنتا ہوں کہ دعویٰ خون ثابت کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلیک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنر مدعی نہ ہوئے۔ قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سر دادہ از جور باغچہ نالی
در کیش روزگاراں گل خوں بہا ندارد

خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

اکتوبر ۱۸۵۸ء

بھائی!

ایک خط تمھارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی، لیکن چونکہ وہ امر لکھنے کے لائق تھے اس واسطے ایک لفافہ تمھاری پسند کا تمھاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ کہ آج میر نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط میں لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین اور گئے اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے کہ میں اور وہ ایک دن پانی پت سے چلے، وہ اُدھر گئے اور میں ادھر آیا۔ ظاہرا پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوئے ہیں۔ اُن کی کتاب رہ گئی۔ اب اُن تک کیوں کر پہنچے گی؟ خدا خیر کرے۔

میاں لڑکے سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں۔ شاہ محمد اعظم صاحب کی، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمھارے علاقے سے اُن کو دعا لکھتا ہوں۔ صوفی صافی ہوں اور حضرت صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں:

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمھارے اُس سوال کا جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا۔ اب کے خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی۔ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا کہ اگر تمھارے خط میں اُن کو دعا سلام لکھوں گا تو اُن سے تم کاہے کو کہو گے۔ پیرزادہ صاحب یعنی میر نصیر الدین نے اُن کی بندگی مجھ سے کی ہے۔ واسطے خدا کے میری دعا ان کو کہہ دینا۔

نومبر ۱۸۵۸ء

واہ واہ، سید صاحب۔ تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں، جو سخن پردازی کروں؟ بھائی تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو، اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودنیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رودنیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں، لو سنو، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ بے چوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے، کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری، شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کی جھولیاں بھر بھر روپے دیے جائیں گے۔ خیر، آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب ہفتے کو بڑا دن اور اگلے ہفتے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین! تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو۔ اب صورت کیا ہے۔ اور آئندہ عزیمت کیا ہے۔ میر اشرف علی صاحب آپ تو وارد ساز تھے۔ پانی پت میں مقیم کیوں کر ہو گئے، کچھ لکھیے تو میں جانوں۔

میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آئے۔ سلام علیکم، مزاج مبارک، کہیے، مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے تو انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے، کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھائے گا۔ اللہ اللہ اللہ۔ بدھ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء۔

(۱۰)

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع، اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ دن و تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر جمعے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا، دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ ''اسد اللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔'' پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں، جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بہ قدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے وہ جو چاہیں قبول کر لیں۔

بدھ ۲ فروری ۱۸۵۹ء

غالب

میری جان!

خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بڈھا ہونے آیا۔ داڑھی میں بال سفید ہو گئے، مگر بات سمجھ نہ آئی۔ پنشن کے باب میں الجھے ہو اور کیا بے جا الجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنشن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنشن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینا ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تم اپنے سوال یاد کرو کہ اس واقعے سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے: قتیل ہوا لے گئی تو کا ہے سے پچھوں راب۔

علی بخش خاں پچاس روپے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو ہوتے ہیں۔ اُن کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اُس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینا، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو روپے ہوتے ہیں۔ اُس کو اٹھارہ سو ملے۔ حتا جمادار دس روپے مہینے کا نمک خوار۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آئندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بہ طریق مدد خرچ سو روپیہ مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپیہ تو لے لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنشن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے کیسے ملتے؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر نے

طریق ڈاک نکلتے چلے گئے۔ دلی کے حقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منھ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اور صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

فروری ۱۸۵۹ء

(۱۲)

میاں!

کیوں تعجب کرتے ہو یوسف مرزا کے خطوط کے نہ آنے سے؟ وہ وہاں اچھی طرح ہے۔ حاکموں کے ہاں آنا جانا، نوکری کی تلاش۔ حسین مرزا صاحب بھی وہیں ہیں۔ وہاں کے حکام سے ملتے ہیں۔ وہاں پنسن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر ہفتے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں۔ جواب بھیجتا ہوں۔

بھائی لکھنو میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ فساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بہ قدر رتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ محلے میں ہندو بھرے ہوئے ہیں، اہل اسلام نہیں ہیں، ہندو کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ تو آفت دلی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنو کے سوا اور سب شہروں میں عمل داری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: ''ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بہ شرط ادخال جرمانہ۔'' مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار قوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبے سے

دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔

یہ تو کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا احوال سنو۔ بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں فنسن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور و محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی، چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آئندہ کو فنسن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا چھٹے مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

میرن صاحب، جو بلائے گئے ہیں، اس طلب کے جواب میں بھی کیوں نہیں لکھتے کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کر کر بھیج دو تو آؤں۔ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔ اور میرن صاحب کو مبارک باد کہنا۔

فروری ۱۸۵۹ء

(۱۳)

میری جان سنو داستان، صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمھارے باب میں، لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کر لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمد ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا: "ایک میکلوڈ

صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔'' میں نے عرض کیا ''کل حاضر کروں گا۔'' پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ بھی گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو میر مہدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمۂ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یوم التعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا، دو شنبہ، ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی، کہا ''اچھا! توقف کرو۔'' بعد تھوڑی کے گزرے کپتان کی چٹھی آئی، سواری مانگی، جب سواری آ گئی، باہر نکلے۔ میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں۔ کہا، منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ اُدھر سوار ہو گئے، میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ، یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سارٹی فکٹ گورنروں کے لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ ''بہت اچھا'' کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھارے پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب کو کچھ لکھا ہے۔ تم اُن سے ملو۔'' عرض کیا، بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا، گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے۔ جیسا کہ وہ حکم دیں گے اس کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں گے، جب جاؤں گا۔ دیکھو سید اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس ڈھنگ سے کہ وہ آج سلطنت کا بندہ ہے۔ میرے تکفل کا حکم بھجوا دیا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد دی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟ میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھا دینا اور اُن کو اور نصیر الدین چراغ دلی کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا۔

مارچ ۹ ۱۸۵۹ء

میر مہدی!

جیتے رہو، آفریں، صد ہزار آفریں۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔

میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کیا پوچھتے ہو۔ لارڈ الن برا صاحب کے عہد میں ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی۔ سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دلی سے فلاں شخص کے پنسن کے کل چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تا کہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل فوراً بطرز مناسب ہوگئی۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ مل جائے گا اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا: صاحب! یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات شاید برسوں میں میسر آئے گی۔'' میں چپ ہو رہا۔ آج دو شنبہ، دہم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ پر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔

حاکم پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ حکم ہے کہ '' دستنبو'' منگا کر، اور تم دیکھ کر، ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔'' چنانچہ حاکم دلی نے ایک کتاب مجھ سے یہی کہہ کر مانگی

اور میں نے دی۔ اب دیکھوں حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔

اس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب بھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔

میر سرفراز حسین، میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا۔

دوشنبہ ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء

یکم شعبان ۱۲۷۵ھ

(۱۵)

سید!

خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔ ایک قریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر چھا سا لگا ہے۔ تم کو سرمایۂ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے۔ میری اُن کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی! یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوئی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ستائیس مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں۔ آج ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک ''دستنبو'' نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر، اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الٰہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔

پنسن کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آ جائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء

(۱۶)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد ہے یہ شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے۔

کل سے مجھ کو مجلس بہت یاد آتا ہے، سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہرحال کچھ لکھتا ہوں، دیکھو کیا لکھتا ہوں۔

سنو، پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال نہیں معلوم...... دیر آید درست آید۔ بھئی، میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت، بلکہ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے، اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے، کیا

غضب ہوا کہ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میرؔ کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانیں
دلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے:

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

''میرؔ'' کی جگہ ''میرن'' اور ''رہا'' کی جگہ ''بچا'' کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل مرزا یوسف کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خان عرف نواب جان، والد اُن کا واتم الجنس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اُس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی، اب تم چاہے بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ، میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں، جس کا روزمرہ ہے، کھلونے منگا دو، میں بھی بجار جاؤں گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط اُن کو ضرور سنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۷)

برخوردار کامگار میر مہدی!

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ سچ میرا حلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان، چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا اور ہاں، ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے، سو وہی ہوا۔ تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ لو، اب بتاؤ، خط لکھنے بیٹھا ہوں، کیا لکھوں۔ یہاں کا حال، زبانی میرن صاحب کی سن لیا ہوگا، مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا، بے اصل باتیں ہیں۔ محسن کا مقدمہ کلکتے میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر، یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ کر چھوڑ دی، میرا اس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آگئے، دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ وہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین کے سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوزہ ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اس کے سر پر ایک ٹوکرا، اس پر گھاس بھری ہوئی۔ میں نے کہا۔ آہاہا، سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں، لطف عام ہے، یعنی شراب نہیں آم ہے۔ خیر، یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربہ مہر گلاس سمجھا، کیوڑے سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ چشمہ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ باسی تھے۔ چار دو بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے۔ تا ان کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا، بھائی، یہ کیا کم ہے؟ مگر میں تمھاری تکلیف و تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد دولت زیادہ۔

کیوڑے کے معنی تم نہ سمجھے ہوگے۔ ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت

لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو، اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہوں تو ہوں۔

مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو، کہ وہ ان کے علم کی کمی ہیں اور گئے گئی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں، میری دعا کہہ دینا۔

مرقومہ چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء

(۱۸)

میری جان!

تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے تو جواب ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ ''محلقین رؤسکم'' پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے: ''دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم'' واللہ، اُن کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آ گئے اور بحال و برقرار ہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سنی جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ خبردار بھول نہ جائیو۔ تمھاری شکایت ہائے بے جا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا، تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ، ۱۵ اکتوبر، صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ حقہ پی کر بیٹھا تھا کہ تمھارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو، تمھارا گلہ بے جا یا بجا؟ بھائی گلہ کرو تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی، اور ہاں یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میر نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ نہ اُن کی خیر و عافیت نہ اُن کی بندگی۔ اگر وہ مجھ سے خفا ہیں تو اُن کی بندگی نہ لکھئے، خیر و عافیت تو لکھئے،

یہ باتیں اچھی نہیں۔

میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں، تجا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ اُن کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آجائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کی بود و باش کی حقیقت لکھو۔

رہا میر افضل، اس کا ذکر نہ کرو، اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایے کو مکان ملنے لگے..... چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ اب خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے، آیندہ کیا ہوگا؟

سلطان العلما مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگرچہ بہ نظر اُن کے مدارج علم و عمل پر، بندگی چاہیے، مگر نیر میں عزیز داری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۱۹)

بھائی!

نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غم گین نہ ہونا، کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے آگئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگاؤں گا۔ سہ شنبہ ۸ نومبر صبح کا وقت ہے، جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمھارا خط آیا تھا، آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں، اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین پر ان کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا، ہاں عظیم النسا بیگم نام اچھا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے، شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی۔ مجتہد العصری کو میری دعا کہنا۔ تم کو کیا ہوا کہ تم ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟ ''پون ٹوٹی'' کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ ''دارالبقا'' فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔

حاکم اکبری آمد آمد سن رہے ہیں۔ دیکھئے دلی آئیں یا نہیں۔ آئیں تو دربار کریں یا نہیں۔ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں۔ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں۔ پنسن کا تو کہیں ذکر ہے نہ کسی کو خبر ہے۔

سہ شنبہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء
غالب

(۲۰)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بیا نا سودیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا، شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا، جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش میں کرتا ہوں؟ استغفر اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔ یا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بیچ کر بکری خریدوں گا اور

پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی، یہ تو میں نے اپنا رازِ دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا، اس پنشن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں، لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے؟ خلعت ملے یا نہ ملے؟ اس بیچ میں ایک اور پیچ آپڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر صرف اسی کا انتظار نہیں۔

اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنشن کے ملنے نہ ملنے کا آرزو دیدہ دستور رہے گا۔ سبک سیر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنشن جاری ہوئے پر بھی تو سوا رام پور کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثابت قدم اختیار کیا اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب! یہ میرن صاحب نے جو دو سطریں دستخط خاص سے لکھی تھیں، واللہ، میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

نومبر۹ ۱۸۵۹ء

(۲۱)

بھائی!

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر پندرہ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے، کہاں

اترتے ہیں۔ اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض تھیں جو باقی رہے ان میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی۔ حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس، بس۔ رہے دربار عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھہنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔"

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔

مرقومہ صبح جمعہ ۹ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ

۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۲۲)

بے مے نکند در کف من خامہ روانی
سرد است ہوا، آتش بے دود کجائی

میر مہدی!

صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف

ٹھٹھرتا ہوں، آگ تاپتا ہوں۔ آگ میں گرمی کہاں، مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں! تم فسق، فسق کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور فسق کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اُس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو فسق کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔

دیکھیے، کیا جواب آتا ہے۔

بہر حال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی، وہ یوسف ہند کی، یوسف دہر کی، یوسف مصر کی، یوسف ہفت کشور کی۔ اُن کی زلیخا نے تم پر پا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپے مہینا بھیجا جاؤں گا۔ اب اُس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ عبارت پڑھوا دینا۔ میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیر الدین کو دعا، حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ یوسف ہفت کشور کو دعا۔

سہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۲۳)

میاں لڑکے!

کہاں پھر رہے ہو؟ اِدھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلّی کے علاقے کے جاگیردار بہ موجب حکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔

غرض کہ چہارشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند فلسن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں ممکن۔ تحریر ڈاک سے بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت درپیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی واگذاشت کا حکم عام ہو گیا ہے جن کو کرایہ پر ملی ہے ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ، یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے۔ میرن جی صاحب کو یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ چاہو یہیں رہو۔ چاہو پھر چلے جاؤ۔ میر سرفراز حسین، میر نصیر الدین، میرن صاحب کو میری دعائیں کہنا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دینا کہ وہ صبوب جو تم نے مجھ کو دی تھیں، ان کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ اللہ موجود، ماسوی معدوم۔

یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء　　　　اپنی مرگ کا طالب غالب

(۲۴)

اہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رام پور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

تمھارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے، نہ عرف لکھنے کی حاجت، نہ محلّے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب لیا

کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء

(۲۵)

میر مہدی!

تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں کر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی، میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ، کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بہ شرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے سو روپے مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو وہاں گیا تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپے، بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات

بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس، یہ ہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ انگریزی کی سرکار سے دس ہزار روپے سال ٹھہرے۔ اُن میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔ ایک صاحب نے نذر دیے۔ مگر تین ہزار روپے سال۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بلا رہا، خاں صاحب بسیار مہربان دوستان، القاب، خلعت: سات پارچے اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشش، بانظر، تعظیم کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان، یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔

کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کرلیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جمعہ ۶ اپریل ۱۸۶۰ء

(۲۶)

میاں!

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار، چشم بیمار کیا جانو؟ خیر فہمی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو۔ عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نورِ چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ ورنہ یہ بال بال بچ گیا۔ جو اس کے خلاف کہے اس کو غلط جانتا۔

میں نے خط تمھیں جان کر نہیں لکھا۔ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید، میں وہاں آؤں گا۔

مجھ کو خط بھیجنے میں تامل ہوا، لکھتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو۔

تنخواہ کی سنو۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے۔ سو مدد خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو عمل فعل کی نذر ہوئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرض دار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سود مول سات کم پندرہ سو ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو بانٹ دے، نو سو بچے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پان سو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔

خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا، معجزۂ اسد اللّٰہی ہے۔ ان پنسنوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللّٰہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے۔

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی، ترکی، جواب عربی، عربی۔ جو انھوں نے لکھا، وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں، دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھی، وہ مجتہد ہوں، ہوا کریں، میرے تو فرزند ہیں۔ میں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی دعا۔

اوائل مئی ۱۸۶۰ء

جانِ غالبؔ!

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے۔ کئی بار، مگر میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔ اب کے بار درد میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں سید صاحب نہیں آئے۔

تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے ہیں اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اڑی، اس کو آپ نے ازراہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہرحال، اچھے ہو جاؤ، اور جلد آؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ اُن دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پا گیں۔

چہار شنبہ ۶ جون ۱۸۶۰ء

(۲۸)

میاں!

تمھارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے۔ دو کا جواب لکھتا ہوں۔ تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمھیں کیا لکھوں۔ پہلی بات، میاں محمد افضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات، میر نصیر الدین آئے اور ان تینوں صاحبوں کا عہد جانے

کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔ تیسری بات میرن صاحب کو، جب تک تم نہ کہو، میں دلی نہ بلاؤں۔ گویا ان کے عاشق تم ہی ہو، میں نہیں۔ بھائی، ہوش میں آؤ۔ غور کرو۔ یہ مقدور مجھ کو نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینا مقرر کر دوں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خاں دوراں خاں کی حویلی کے کھنڈر دیکھتے پھرو۔ اے میر مہدی! تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا ہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ اللہ اللہ

سہ شنبہ ۴ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ، ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء

(۲۹)

میاں!

تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویریں جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی، وہ انھوں نے واپس کر دی اور اس کی نقل کے باب میں یہ کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے۔ جب وہ تیار ہو جائے گی، میں ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔

پنسن سراسر سب کو شش ملنے کا حکم ہو گیا۔ ہر مہینے میں سو دی لو اور کھاؤ۔ کشمیری کٹرہ بگڑ گیا۔ ہائے! وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دورویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہو گئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا

چلتی ہے، ابر آتے ہیں، مگر صرف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرہ، تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ نو سیر، ساڑھے نو سیر۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ جےپور میں ہیں یا یہاں ہیں۔ میر نصیر الدین دو بار میرے پاس آئے۔ اب مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ قاسم علی خاں قطب الاقطاب ایک دن کہتے تھے کہ میر احمد صاحب کے قافلے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آخر وہ شادی بھی کب ہونے والی ہے اور کہاں ہونے والی ہے؟ اس کا جواب لکھو تو سب حالات مفصل لکھو۔

صبح چار شنبہ چہارم جنوری ۱۸۶۱ء غالب

(۳۰)

لو صاحب! یہ تماشا دیکھو۔ میں تو تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں۔ حال آں کہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اترے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اترنا کیسا، ملنے کو بھی تو نہیں آئے۔ افسوس ہے، جن کو میں اپنا سمجھتا ہوں، وہ مجھ کو بیگانہ جانتے ہیں۔ اب تم یہ پوچھو کہ نصیر الدین کا دلّی میں ہونا اور مجتہد العصر کا یہاں آنا تو نے کیوں کر جانا۔

بھائی! آج بدھ کا دن، ۲۸ جمادی الثانی کی اور ۱۱ جنوری کی صبح کے وقت منہ اندھیرے اسی وقت میری آنکھ کھلی تھی۔ لحاف میں لپٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیر الدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ میں اب جاتا ہوں اور میر حسن صاحب بھی جاتے ہیں۔ میں سمجھا میر سرفراز حسین۔ جب بعد تکرار معلوم ہوا تو میر حسن بے پردے آئے اور خدا جانے کہاں اُترے اور اب کہاں جاتے ہیں۔ ہے ہے! مجھے غیر سمجھا یا مرا ہوا سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے، اپنی سسرال میں رہے اور بیٹے کو چھوڑا۔ واللہ، میرا جی ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا

تھا۔ اب اٹھا ہوں۔ سردی رفع ہوئے، دھوپ نکل آئے۔ آغا جان کے پاس آدمی کو بھیجتا ہوں۔ میں کم بخت یہ بھی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا۔ جب آغا جان کے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ میر حسن صاحب ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور ان سے ملوں گا۔

تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے چچا کے یہاں آنے کا منشا اور ان کا احوال مفصل لکھو۔ تصویر کا حال آگے لکھ چکا ہوں۔ خاطر جمع رکھو اور مجتہد العصر اور میرن صاحب کا حال لکھو۔

صبح جمعہ ۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء　　　　نجات کا طالب۔ غالب

(۳۱)

جان غالب!

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا۔

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی:

میاں، یہ اہل دہلی کی زباں ہے

ارے اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

خس کی ٹٹی، پروا ہوا، اب کہاں لطف؟ وہ تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال، مے گزرد۔

مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں، واللہ، اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہیدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا اُن کی مصاحبت نہیں۔ ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۔۱۸۶۰ء

(۳۲)

او میاں سید زادۂ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنونؔ کہاں، ذوقؔ کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہؔ سو خاموش، دوسرا غالبؔ، وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخن وری رہی، نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی۔

سنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں، ولد دلاور خاں اور نانا اُن احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے، عمر کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! خوب پہچان کر لکھو اور جلد لکھو۔

پنجشنبہ ۲۳ مئی ۱۸٦۱ء

(۳۳)

اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم۔

حضرت! آداب۔

کہو صاحب آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔

حضور میں کیا منع کیا کرتا ہوں؟ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلف کریں۔

نہیں، میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہو

ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

سُبحان اللہ، سُبحان اللہ، اے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

سنو میر مہدی صاحب! میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہوگئی۔ حقوس کے رفع ہو جانے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگی۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں، حکیم میر اشرف علی اور ان میں کچھ کونسل ہو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا ہیں؟

پوچھو اور نہ چھوڑیں، جب تک نہ نہائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلما اور مجتہد العصر بن گئے۔ کیوں وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء

(۳۲)

میاں!

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہادیے۔ خوش دامن صاحب بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار، چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان جان نہ پہچان، ورنہ ہم سائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے، مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے، اور وہ محل غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے: ''بھائی میں دلی سے آیا ہوں، قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔'' زنہار نہ باور

کچو۔ مال مفت ہضم کر لیجو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو۔ قلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کو پہنچانے کو گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی، کون برا اور کون اچھا ہے۔ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلما مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق، فلسفہ پڑھو، جو آدمی بنا چاہے۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے۔ مذہب حق والسلام والاکرام علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

مئی ۱۸۶۱ء

(۳۵)

برخوردار!

تمھارا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ اور کا کچھ حال معلوم کروں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں ان کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھ لوں، تو اس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہوگا۔ ناچار جو کچھ اور کا حال سنا ہے، وہ، اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔

ہر چند میں نے دریافت کرنا چاہا مگر حکیم محمود علی کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا طور قرار پایا، کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صرف خبر واحد ہے کہ ان کو راؤ راجا نے صاحب

اجنٹ سے اجازت لے کر بلایا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب اجنٹ الور نے راجا کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے، کیا عجب ہے کہ ان کا راج ان کو مل جائے۔ کہتے ہیں کہ راؤ راجا نے اہل خطہ کے فراق کی شکایت حاکم سے کی تھی۔ جواب پایا کہ وہ لوگ مفسد اور بدمعاش ہیں اور تمھاری برادری کے لوگ ان سے ناخوش ہیں۔ ان کے آنے میں فساد کا احتمال ہے، وہ نہ آنے پائیں گے۔

مولانا غالبؔ علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کے کاہیں مرادش میسر بود
اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین صاحب کو دعائیں اور دیدار کی آرزو مندی۔

۱۸۶۱ء

(۳۶)

سید صاحب!

کل پہر دن رہے تمھارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اس وقت تک یا شام کو میر سرفراز حسین تمھارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لوگے۔ میں کیا لکھوں، میں نے جو کچھ سنا ہے انھی سے سنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ

ہوگا۔ سو روپے کی ناحق زیر باری ہوئی۔ چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی تو مجھے بھی شرمساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں عرب احد کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا۔ اغلب کہ اسی ہفتے میں غایت اسی مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔

کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ ''قاطع برہان'' کے حاشیے پر کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ واللہ علی کل شئی قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں، علی کا غلام۔ میرا خدا کریم، میرا خداوند علی:

علی دارم، چہ غم دارم

وبا کی آنچ مدھم ہوگئی ہے۔ پانچ سات دن بڑا زور شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضا کر کے مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور میں بھی وبا سے الگو ہر دولی ختیر یا الک صاحب مر گیا۔

واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور رازق میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

جمعہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء

۱۷ محرم ۱۲۷۸ھ

(۳۷)

بھائی!

تم سچ کہتے ہو:

بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد

لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیادتی میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح سے یہ آئے ہیں اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے موافق ہے لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے۔ یعنی میں بھی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہوگا؟

دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرتا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا۔ بہ ہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد احباب مشفق کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔

اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں، سوداگر

نہیں، مہتمم طبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم، مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلی شہر، راے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت کتاب چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔ طالبان کتاب کو اطلاع دو۔ دو، چار، دس، پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں، محمد حسین خاں کے نام پر، دلی راے مان کے کوچے، مصوروں کی حویلی کا پتا لکھ کر ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد، چاہو ٹکٹ ارسال کرو۔ مجھ کو کیا اور تم کو کیا؟ جو کہے اس کو یہ جواب دے دو۔

وبا تھی کہاں، جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔ پنجشنبہ ۱۸ اگست کی۔ قمری مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو دو موذن سے رکھ کر کئی آدمی دیکھا کیے۔ ہلال نظر نہیں آیا۔

پنجشنبہ ۱۸ اگست ۱۸۶۴ء نجات کا طالب۔ غالب

(۳۸)

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں۔ جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ جل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور وہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح سے خط بھیجتے رہو۔

کیوں سچ کہیو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ

ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ گویا وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ لکھی تھی۔ اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو، خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔

تبرکاری کی میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں۔

نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔

کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسل صحت کیا ہے۔ باقر علی خاں کو مہینا بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔

شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا چلتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی خیر خوشاں ہے۔ کاغذ بھر گیا، ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

یکشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء۔

(۳۹)

صاحب!

آج تمھارا خط دوپہر کو آیا۔ اس میں میں نے مسودہ تاریخ کا پایا۔ قلم دان میں رکھ لیا۔ خط پڑھ کر میر سرفراز حسین کو بھیج دیا۔ کل وہ کہتے تھے کہ انتیس روپے کو تین گاڑیاں مقرر ہو گئی ہیں۔ میں کل، یعنی آج شام کو سوار ہو جاؤں گا۔ اب اس وقت جو میں یہ خط لکھ رہا ہوں،

پیر دن باقی ہے۔ لکھ کر کھلا رکھ چھوڑ دوں گا۔ شام کو مجتہد العصر میرے گھر ضرور آئیں گے۔ اگر آج جائیں گے تو واسطے تودیع کے، اور اگر نہ جائیں گے تو موافق معمول کے آئیں گے۔ ان کے جانے نہ جانے کا حال صبح کو اسی ورق پر لکھ کر خط بند کر کے بھیج دوں گا۔ خدا کرے، اردو کی نثر کا لفافہ انھوں نے ڈاک میں بھیج دیا ہو۔ شام کو مجھے دے جائیں تو میں کل اس خط کے ساتھ اس کو بھی بھجوا دوں۔

مہاراج اگر دورے کو گئے تو کیا اندیشہ ہے؟ گرمی کا موسم ہے، لمبا چوڑا سفر کیوں کریں گے؟ آٹھ سات دن پھر آئیں گے۔ یہاں کی تلاش کا نتیجہ دیکھو، تب کہیں جائیے۔

میرن صاحب کی تمھاری بجا ماچاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جانو وہ جانیں۔ کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی یاور علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔ ''قاطع برہان'' کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آ گئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دی رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو پچاس جلدیں منگاؤں۔ دیکھیے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔

میاں، کل شام کو میر سرفراز حسین میرے گھر نہیں آئے یا تو الور کو، مجھ سے بغیر رخصت ہوئے گئے یا نہیں گئے۔ میں تو آج جمعہ، سولہ مئی صبح کے وقت یہ خط ڈاک میں بھیجتا ہوں۔

جمعہ ۱۵ ذیقعدہ و مئی یا ہم ۱۲۷۸ھ — نجات کا طالب۔ غالب

۱۶ مئی ۱۸۶۲ء

(۳۰)

سید صاحب!

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے، بعد القاب کے شکوہ شروع کر دیا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو

پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آگئے۔ کمال یہ ہے کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے، دوست ہوں، عاشق زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔

تمھارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ مخل و درآتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں، وہ آئیں گے تو ہیں، ان کو دے دوں گا۔ محرم تمام ہوا۔ آج سہ شنبہ، غرہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا۔

برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے، سیکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

جناب میرن صاحب کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۷ھ۔ ۲۹ جولائی سال رستاخیز ۱۸۶۲ء

(۳۱)

واہ حضرت!

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا انجام مجھ کو ملا۔ میرا ایت اتلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور، کوئی آئیو، کوئی آئیو، فرو ہو گیا۔ میری جان بچی، میرے آدمیوں کی جان بچی: اکنوں شب من شب است و روزم روز است۔

بھئی، تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا، اگر پہنچتا تو بے شک وہ تمھاری نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ میرا گمان ہے خط نہیں پہنچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا دم ناک میں کر دیا تھا۔ اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے؟ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم اُن سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے؟ نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب اُن سے لکھوا کر بھجواؤ۔

یہاں کا حال وہ ہے جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، قحط مستولی، اناج مہنگا۔

بے چارہ روشنی میر احمد حسین کا بھتیجا، میر امداد علی آشوب کا بیٹا، محمد میر شب گذشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے۔ جوان، صالح، پرہیزگار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مجتہد العصر کا حکم بجا لاؤں گا۔ اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جائے گا اور مدار المہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔

مجتہد العصر کو دعا کہنا اور یہ خط پڑھا دینا، میرن صاحب کو دعا اور کہنا کہ بھلا صاحب تم نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمھاری طرز کا تتبع کریں گے۔ حکیم میر اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں ان میں راہ و رسم تعزیت اور تہنیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قوابل تمھارے بھیجی ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو تو خیر، ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ۔ شعر:

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے، جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلم دان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟ پانچ چار دن سے فرصت ہے، مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی۔ کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

اور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرت اندوہ و غم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔

سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجا کو اختیار ملے گا۔ ہاں ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔

بارے رفع مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو، تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں:

تندرستی ہزار نعمت ہے

ہائے پیش مصرعہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو بہت پسند آیا ہے:

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ آہاہا میر افضل علی صاحب کہاں ہیں۔ حضرت! یہاں تو اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ بے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں؟ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔

صبح جمعہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء

(۳۲)

میری جان خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔ اسکے وجہ میں نہیں سمجھا۔ تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ لکھوں۔ تمہارے۔ نواب یوسف علی خان ناظم کا دیوان میرے پاس کہاں۔ نواب صاحب نے مستقل ارمغان مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔ یہاں کچھ بکنے آگئے تو میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفیٰ خان کو جہانگیر آباد بھیجا۔ اب محمد بخش اور میر جی سے کہہ دونگا اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد میر سرفراز حسین کو بھیج دوں گا۔

توقع نوکری کا حال مجھ کو مفصل معلوم ہے۔ یہ بھی بادشاہ ہے تنخواہ ہوئے کہ روپیہ دے کر مول لیں اور کہیں '' ہمیں نذرانہ دیا ہے بشرط نوکر ہو جانے کے بیر میں مہینوں تک اپنا دیا ہوا روپیہ مسترد کرتا ہوگا۔ نوکری مقت میں مقدر رو اور تقدیر موت ہے، کون کہیگا فلانے کے مقدر اچھا ہے۔ کون کہیگا ذکے تقدیر بُرا ہے۔ یہ مسئلہ صاف ہے تذبذب نہیں، تو شے بھی مقدر

کو موت لکھا ہوگا تمکو تردد کیوں ہوا؟

جوان مرد، جوان بخت، جوان دولت، جوان عمر، جوان سال، جوان خرد، جوان مرگ، یہ الفاظ مقررہ اہل زبان ہیں، کبھی مقلوب و معکوس نہیں آتے۔

اودھ اخبار میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھ دی ہے مگر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئے۔ نریندر سنگھ راجۂ پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجد جامع کے واگذاشت کی خبر مشہور ہے اگر سچ ہو جائے تو کیا رہے۔ شاہ اودھ کے املاک کی بھی واگذاشت کی خبر ہے۔

لو بھائی اب اور کیا کہوں۔ سر راہ کے منظر یہ کے پاس جو تخت بچھا ہے اوپر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ بس اب یہ لکھنا باقی ہے۔ مجتہد العصر کو دعا اور میر افضل علی صاحب کو دعائیں۔

صبح یکشنبہ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ

۲۰ نومبر سال حال ۱۸۶۲ء

غالب

(مہر) غالب

(۳۳)

جو یائے حال دلی والو سلام لو

مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ جنوبی قبر کی طرف کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ عشرہ و مبشرہ یعنی دس آدمی منتظم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں، تین یہ اور سات اور۔

۷ نومبر، ۱۴ جمادی الاول سال حال، جمعے کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور کل کی اور ہے کل سے رات

کوری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

راجا پٹیالہ مر گیا۔ مہندر سنگھ اس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے۔ ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے وہ تو اب گورنر کے آنے پر کھلے گا اور وہ فروری مہینے میں یہاں آئیں گے۔

الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی انھیں اختیار دیں گے۔ یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اسی وقت پر ہوگا۔ بالفعل اپنے صاحب اجنٹ الور دلی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجا صاحب تجارہ تک ان کی مشایعت کر گئے۔ یہاں اپنے صاحب سے کوئی صاحب سنگھ ٹھیکیدار، الور کی سڑک کا ہے، اس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں پنچوں کو اختیار ہے، ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اسفندیار بیگ متوفی کا کوئی عزیز متدعی پرورش ہوا، اس کو بھی یہی جواب ملا۔ اب اور بولو کیا لکھوں۔

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر، بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا، ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا، پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی؟

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب اور ڈاکٹر حسین افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا۔

منگل کا دن ۲۳ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ

۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء پہر دن چڑھے

غالب

برخوردار!

تمھارا خط پہنچا، مگر یہ غضب ہے کہ میں اس کا جواب نہیں لکھ سکتا اور وہ جواب طلب ہے، جواب کیا لکھوں؟ قواعدِ عمل داری کے برہم ہو گئے۔ نئے نئے دستور ہیں۔ شہرت ہوئی کہ لارڈ صاحب آتے ہیں۔ فروری کو انبالے پہنچیں گے۔ اہلِ دلی کی ملازمت وہاں ہوگی۔ اب یہ آواز بلند ہے کہ فروری میں کلکتے سے چلیں گے۔ بنارس، الٰہ آباد، اکبرآباد ہوتے ہوئے مارچ کو انبالے پہنچیں گے۔ الور، جے پور، کوٹہ یہ تین راجا آگرے پہنچ گئے۔ وہاں میر فرش کی طرح بے کار دھرے ہوئے ہیں۔ الور کے راجا گویا یوسف ہیں، اُن کے خریدار دوڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی شکرم، کوئی کرانچی ڈھونڈھ رہا ہے، کوئی پیادہ چل نکلا۔ کسی نے مانگے کا ٹٹو بہم پہنچایا۔ یہ سب قصے ایک طرف، اب سنتا ہوں کہ راجستھان کے اجنٹ نے سب رئیسوں کو لکھا ہے کہ لارڈ صاحب تمھیں بلاتے نہیں جس کا جی چاہے آؤ، جس کا جی چاہے، نہ آؤ۔ اس تحریر کو دیکھ کر جو وعدہ گاہ پر جا پہنچے، وہ پشیماں ہیں، جو راہ میں ہیں وہ متوقف رہے ہیں، نہ آگے بڑھتے ہیں، نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے نہ ہلے تھے، وہ بیٹھے رہے۔

یہاں دو تین مہاوٹیں برس گئی ہیں۔ گیہوں چنا اچھا ہوگا۔ ربیع کی امید پڑی:

اقتضا ہے از ابر بہمن مے

ستانید جام من از دے تہی

سیدھے ہاتھ پر ایک زخم، بائیں بازو پر ایک گھاؤ، سیدھی ران پر ایک پھوڑا۔ یہ حال میرا ہے۔ باقی خیر و عافیت۔ میر سرفراز حسین صاحب اور میرن صاحب کو دعا پہنچے۔

جنوری ۱۸۶۳ء — غالب

(۳۵)

نورچشم، میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ کلیات فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا۔ میاں، اس میں اغلاط بہت ہیں۔ مبارک ہو تمھیں اور میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور بھائی، خدا کرے، مجھ کو بھی، لو صاحب، اجنٹ بہادر راجستھان کا حکم الور کے اجنٹ کو آیا کہ تم پہلی ستمبر کو راج کے کاغذ، جو تمھارے پاس ہیں اور راج کا اسباب، جو تمھارے تحت میں ہے، وہ سب راجا صاحب کو دو اور تم الگ ہو جاؤ۔ ستمبر کی دسویں کو ہم الور آئیں گے۔ راجا صاحب کو مسند پر بٹھائیں گے۔ خلعت شاہی انھیں پہنائیں گے:

ستمبر ختم بر دو آور دو داد

شنبہ ۲۲ اگست ۱۸۶۳ء　　　　　　از غالب

(۳۶)

آہے جناب میر مہدی صاحب دہلوی، بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں۔ میرن صاحب خوش ہیں:

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں۔ ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں، پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا، ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے:

می خواہم از خداونمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را ، ندیدن رقیب را

لف و نشر مرتب ہے:

می خواہم از خدا ، دیدن حبیب را
نمی خواہم از خدا ، ندیدن رقیب را

خوار و زار و خستہ و سوگوار۔ معنی تو اس میں موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو ''المعنی فی بطن الشاعر'' کہتے ہیں۔ یہ شعر اساتذہ مسلم الثبوت میں سے کسی کا نہیں ہے۔ کوئی صاحب ہوں گے کہ انھوں نے لوگوں کو حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کسی استاد کا نام لے دیا کہ یہ ان کا ہے۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے، جو جس کے کانوں کو لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے، اس طرح کہے۔ ''رتھ'' میرے نزدیک مذکر ہے۔ یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کروں گا۔ ناچار مونث بولنا پڑے گا۔ یعنی ''رتھیں آئیں''۔ ''خبر'' مونث ہے۔ بہ اتفاق، مگر ''کاغذ اخبار'' اس کو خود دیکھ لو کہ تمھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا، یعنی ''اخبار آیا''۔ ''بیر ہوئی یا ہوا''؟ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ ''دوشنبہ ہوا''، ''بیر کا دن ہوا''۔ ''نری بیر ہوئی'' یا ''بیر ہوا'' ہم کیوں بولیں گے؟ ''بلبل'' میرے نزدیک مونث ہے۔ جمع اس کی ''بلبلیں''۔ ''طوطی بولتا ہے'' ''بلبل بولتی ہے۔''

بھائی! اس امر میں متفق و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں، جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے۔

سہ شنبہ ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء نجات کا طالب۔ غالب

قرۃ العین میر مہدی و میر سرفراز حسین، مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا۔ میرن صاحب سے تمھاری خیر و عافیت پوچھی اور کہہ دیا کہ میری دعا لکھ بھیجنا۔ بس اب اتنا ہی دم باقی ہے۔ کل میرن صاحب آئے۔ پوچھا کہ اور سے کوئی خط آیا۔ فرمایا کہ اس ہفتے میں کوئی خط میں نے نہیں پایا۔ کیا کہوں کہ کیا حال ہے۔ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا۔ یعنی سعیِ بے حاصل کی لذت خاک میں مل گئی — اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

سہ شنبہ ۱۸ شعبان ۱۲۸۱ھ
۱۷ جنوری ۱۸۶۵ء

مرگِ ناگاہ کا طالب۔ غالب

(۴۸)

برخوردار نورچشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو۔ بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا، جو تم مانع نہ آئے۔ کیا تپ انّا بن کر آئی تھی، جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے؟ حکیم اشرف علی ابھی گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ

ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمھاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔

سنو میاں سرفراز حسین، بیزار ہوں میں۔ تم نے مجھ کو ایک خط لکھا۔ وہ بھی اس طرح کا کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے:

بہ غیر در شکر آب ست ورد و بہا دارد

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈھتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے؟ مجھ کو کیا پیام ہے؟ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یا رب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تحریر میں القاب میرا۔ پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سبب ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا۔

اور ہاں میاں، پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سنا ہوگا؟ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تا کہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے۔ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ توضیح بہ قید نام لکھو۔

(۳۹)

برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی، اردو بازار کے مولوی، صاحب لوائے ولائے تقوی پر علم عباس ابن کا سایہ۔ راجا صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ الحمد للہ علی کل حال دیکھیے، اب معاودت کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو

کیوں کر طلب کرتے ہیں۔ کلکتے جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں آ کر اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ اگر وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔ ظاہرا ہمارے تمہارے واسطے زمانہ انجامِ مصیبت اور وقتِ پیش آمدِ دولت ہے۔ اب مجھ کو میرن صاحب کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ وہ مقرب بنیں گے، اگر میری قسمت لڑے گی۔ تم میری کامیابی کا سامان کر رکھنا۔ میرن صاحب کو مجھ پر مہربان کر رکھنا بھائی! یہ جو میرن صاحب یا امیرن صاحب ہیں، حضور کے بڑے مصاحب ہیں۔ جس گروہ میں سے جس کو چاہیں حضور سے ملوا دیں۔ فرقۂ شعرا میں سے جس کو جو کچھ چاہیں دلوا دیں، اُن کو اور مجتہد العصر کو میری دُعا کہنا۔

نجات کا طالب۔ غالبؔ

(۵۰)

وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروج تھی۔ اُس میں ''خُر'' بہ ضمۂ معجمہ ''نورِ قاہر'' کو کہتے ہیں اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے، اسی واسطے آفتاب کو ''خُر'' لکھا اور ''شید'' کا لفظ بڑھا دیا۔ ''شید'' بہ شین منقوط و یائے معروف بروزن ''عید'' روشنی کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اُس ''نورِ قاہر ایزدی'' کی روشنی ہے۔ ''خُر'' اور ''شید'' یہ دونوں اسم ''آفتاب'' کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابرِ عرب نے کہ وہ منبعِ علوم ہوئے، واسطے دفعِ التباس کے ''خُر'' میں واو معدولہ بڑھا کر ''خور'' لکھنا شروع کیا۔ ہر آینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا اور منظور کیا اور فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر جہاں ''خُر'' بے اضافہ لفظ ''شید'' لکھتا ہے۔ موافق قانون علمائے عرب بہ واو معدولہ لکھتا ہے، یعنی ''خور'' اور جہاں بہ اضافہ لفظ ''شید'' لکھتا ہے۔ وہاں بہ پیروی بزرگانِ پارسی سرِ یہ سر لفظ ''خور'' کو بے واو لکھتا ہے۔ یعنی

''خرشید'' ''خُر'' کا قافیہ ''دُر'' اور ''پُر'' کے ساتھ جائز اور روا ہے، خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واو کیوں لکھوں؟ رہا ''خورشید'' چاہو بے واو لکھو، چاہو مع الواو لکھو۔ میں بے واو لکھتا ہوں مگر مع الواو کو غلط نہیں جانتا اور ''خُر'' کو بھی بے واو نہ لکھوں گا۔ قافیہ ہو یا نہ ہو، یعنی نظم میں وسطِ شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو ''خور'' لکھوں گا۔ یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح ''خُر'' ترجمہ ''قاہر'' کا ہے اسی طرح ''جم'' ترجمہ ''قادر'' کا ہے کہ بہ اضافۂ لفظ ''شید'' اسم شہنشاہِ وقت قرار پایا ہے۔

مجتہد العصر و میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ تمھیں وہاں کوئی مجتہد العصر نہ کہتا ہوگا، نہ کہو، تم کو کیا؟ میں نے کہا، تم نے مان لیا، اب کوئی کہے یا نہ کہے۔

میاں بدرالدین سے ایک مہر کھدوا دوں گا:

جناب مجتہد العصر سرفراز حسین

بس تم یہ مہر خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر کرنی شروع کرنا، سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو اور ان کے فرزند کو دعا پہنچے۔

میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن، اب وہ حسن کا پردہ کھول ڈالا۔ ساقیاں مجھ پر لپٹتا ہوں، دم بدم بگڑتا ہوں۔ وہ لوگ کہاں جو پردے سے لپٹ کر ساقی کو گے اور پانی کو خفا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو۔ اب کہاں ابر، فقط پندرہ دن کی اور باقی ہے۔ آیندہ خدا رزاق ہے۔

اکائی نمبر 25: غالب کے قصیدہ ''ہاں مہ نوسنیں ہم اس کا نام''

اکائی کے اہم اجزاء

مقصد۔

تمہید۔

غالبؔ کی قصیدہ نگاری۔

غالبؔ کے قصیدے کی تشریح۔

غالبؔ کے قصیدہ ''ہاں مہِ نوسُنیں ہم اُس کا نام'' کا تنقیدی جائزہ۔

مقصد :- اِس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اُردو زبان کے عظیم شاعر قصیدہ نگار کے کلام خصوصاً اُن کی قصیدہ نگاری سے واقف کروایا جائے۔ اور اُن کے کلام میں بنیادی خصوصیات عام روش سے ہٹ کر چلنے سے متعارف کروایا جائے۔ غالبؔ کے قصائد اُردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں جس کی عمدہ مثال اُن کا قصیدہ ''ہاں مہِ نوسُنیں ہم اُس کا نام'' ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ

ا۔ وہ غالبؔ کی قصیدہ نگاری پر اظہارِ خیال کریں۔

۲۔ وہ شاملِ نصاب قصیدہ کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالیں۔

تمہید :- اِس اکائی میں مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے قصیدہ کا متن پیش کیا گیا ہے اور اُس کی تشریح دی گئی ہے۔ جسے پڑھ کر طلبا مرزا اسداللہ غالبؔ کی قصیدہ نگاری کے فن اور اسلوب سے متعارف ہوں گے۔ اُن کے قصیدہ ''ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام'' کی اہم خوبی یہ ہے کہ اِس میں جِدّت طرازی ہے جو ہر جگہ فطری اور قدرتی انداز میں پائی جاتی

ہے۔اس میں شاعرانہ حقائق نگاری ہے۔غالبؔ کے اِس قصیدہ میں الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے۔

مرزا غالبؔ کی قصیدہ نگاری:

مرزا غالبؔ نے جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی جس میں اُردو قصیدہ گوئی بھی ایک ہے۔عام طور پر مشہور ہے کہ مرزا غالبؔ کو اُردو قصیدہ گوئی میں بُلند مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔لیکن مرزا غالبؔ نے بعض ایسے قصائد لکھے ہیں جو اُردو شاعری کا سرمایۂ ناز ہیں۔

غالبؔ کا معاملہ یہ تھا کہ انھیں شاہانہ زندگی گزارنے کی خواہش تھی جو انھیں دربدر لیے پھری،کبھی شاہِ دہلی کی مدح کی،کبھی تاجِ برطانیہ کی شان میں قصائد لکھے،کبھی لکھنؤ اور رامپور کے درباروں سے اُمیدیں وابستہ کیں۔ان کی قدردانی ہوئی اور انعام واکرام سے نوازے گئے لیکن جو کچھ ملا،خواہش اس سے بہت زیادہ کی تھی۔اس لیے آخر تک قصیدے لکھتے اور معقول صِلہ پانے کی آرزو کرتے رہے۔مرزا غالبؔ نے اپنی طبعی شوخی اور فطری ظرافت سے نثر و نظم دونوں کو زعفران زار بنادیا ہے۔غزل ہو یا قصیدہ وہ اپنی شوخی سے باز نہیں آئے۔قدیم اندازِ تنقید کے اعتبار سے غالبؔ نے اپنے اخلاق،ذہن اور جودت پسند طبیعت کے باوجود ہر صنفِ سخن کے آداب کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔غالبؔ کی تعلّٰی میں بھی شاعرانہ لطافت پوری طرح جلوہ گر ہے۔مدح میں بے جا خوشامد نہیں ہے۔البتہ مبالغہ ہے جس کے بغیر قصیدوں کا کام نہیں چلتا۔غالبؔ نے تشبیہات و استعارات میں بھی بڑی فنّی مہارت سے کام لیا ہے۔قصیدہ کا یہی مقام غالبؔ کو دوسرے قصیدہ گو شعرا سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے۔

غالبؔ کے اُردو قصیدوں میں تمام محاسن اس وجہ سے ہیں کہ غالبؔ نے فارسی میں اعلیٰ درجہ کے قصیدے کم کہے ہیں لیکن انھیں فنِ قصیدہ پر پورا عبور حاصل تھا۔غالبؔ نے اُردو میں قصیدہ کہا اور پورے زورِ بیان کے ساتھ کہا۔غالبؔ کی جدت پسندی نے دوسروں کی زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہنے دیا۔غالبؔ نے اُردو کے ہر قصیدہ کے لیے نئی زمین خود دریافت کی۔غالبؔ کی سب سے بڑی خوصیت اُن کی ہمہ گیر شخصیت ہے۔

ابتدائے شعر گوئی سے لے کر عمر کے آخری حصّے تک غالبؔ نے بہت سے قصیدے کہے۔اُردو میں کم فارسی

میں زیادہ۔ ان کے علاوہ چند مدحیہ قطعات بھی کہے۔ یہاں ان کی قصیدہ نگاری کا جائزہ صرف اُردو قصائد کی بنیاد پر لیا جائے گا جن کی تعداد چار ہے۔ ان میں سے دو قصیدے:

۱۔ ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار

۲۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

منقبت میں ہیں اور باقی دو:

۳۔ ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام

۴۔ صبحِ دم دروازہِ خاور کھلا

بہادر شاہ ظفؔر کی مدح میں ہیں۔

یہ قصیدہ جو بہادر شاہ کی مدح میں ہے ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' کی تشبیب نہایت دل کش اور پُر اثر ہے۔ ہلالِ عید کی خمیدہ شکل دیکھ کر شاعر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کے سلام کو خم ہوگیا۔ چناں چہ وہ سوال کرتا ہے کہ اے پہلی تاریخ کے چاند تیری کمر کیوں خم ہے؟ تو کسے جھک کر سلام کر رہا ہے؟ ''ہاں مہ نو سُنیں ہم اُس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام'' شاعر کہتا ہے کہ تو اس کا نام نہیں جانتا تو لے میں بتاتا ہوں:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن

نام شاہنشہ بُلند مقام

قبلہ چشمِ دل بہادر شاہ

مظہر ذوالجلال الاکرام

غالبؔ کے اُردو قصیدوں میں اس قصیدے کی تشبیب سب سے زیادہ پُر کشش اور جاندار ہے۔ نہ مغلق ترکیبیں ہیں، نہ دوراز کار تشبیہیں اور نہ پیچیدہ اندازِ بیان۔ سوال جواب کے انداز نے اس تشبیب کو ایک ڈرامائی شان عطا کر دی ہے۔ کلیم الدین احمد جو اپنے کلاسیکی سرمایئے کی خوبیوں سے زیادہ اس کی خامیوں پر نظر رکھتے ہیں، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

’’یہاں غالبؔ نے بالکل نیا راستہ نکالا ہے۔قصیدے کے رسمی محاسن کا یہاں نام و نشان نہیں۔زبان میں سلاست، روانی، متانت ہے لیکن وہ شان و شوکت نہیں، وہ طمطراق نہیں، وہ بُلند آہنگی نہیں۔قصیدے کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔مثلاً سوداؔ کے ایک قصیدے کی تشبیب اس شعر سے شروع ہوتی ہے ۔

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا باغِ خزاں مستاصل

ایک طرف یہ رنگ اور عموماً یہی رنگ محیط ہے اور دوسری جانب یہ سادگی ہے کہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

غالبؔ

یہاں فضا دوسری ہے، نئ ہے، فطری ہے اور اسی وجہ سے اس میں ایک نازکی ہے، ایک ڈرامائی شان ہے جو مشکل سے کہیں ملتی ہے۔

مرزا غالبؔ اُردو کے عظیم شاعر تھے۔غالبؔ اُردو اور فارسی دونوں کے بُلند پایہ شاعر تھے۔دونوں زبانوں میں اُن کی تصانیف موجود ہیں۔غالبؔ کے کلام میں بُنیادی خصوصیت عام روش سے ہٹ کر چلنے کی تھی۔شاعری میں غالبؔ نے ایک نئ اور الگ راہ نکالی جس میں وہ کامیابی سے چلے۔ غالبؔ کا کلام اُن کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہے۔اُن کے کلام میں غمِ عشق، غمِ روزگار، آپ بیتی اور جگ بیتی سب کچھ موجود ہے۔ غالبؔ نے فلسفہ اور تصوف کے مسائل بھی شاعرانہ پیرایئے میں بیان کیے ہیں۔اِن کا کلام تجزیہ ظرافت، لطیف شوخی، بذلہ سنجی اور نقطہ آفرینی سے بھرپور ہے۔اُن کے کلام میں الفاظ کا استعمال لاجواب ہے۔کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا کرنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔غالبؔ کے کلام کی خصوصیت نے اِنھیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔اُن کا کلام کئ لحاظ سے دماغ پرور ہے۔غالبؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا اور اس کے ہر پہلو کو اشعار میں بیان کیا ہے۔حیات و موت، جبر و اختیار، سوز و گداز، گناہ و ثواب وغیرہ اُن کے کلام میں فلسفیانہ عمیق کے ساتھ پایا جاتا ہے۔غالبؔ نے اپنی فلسفیانہ کاوشوں کو لہجہ کی بُلندی عطا کی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ غالبؔ کے کلام

کی مقبولیت و افادیت بڑھتی جا رہی ہے۔ غالبؔ نے جملہ اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں فنی مہارت دکھائی ہے لیکن سب سے زیادہ کمال غزل گوئی میں حاصل کیا ہے۔

اس کے بعد قصیدہ اور رُباعی میں اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ غالبؔ صاف، باطن اور صاف گو تھے اور ایک ہمہ رنگ قسم کے آدمی تھے۔ وہ کہیں واعظ، کہیں ناصح، کہیں فلسفی، کہیں رند و سرمست اور کہیں موجِ روحانیت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ غالبؔ، اقبالؔ کی طرح فلسفی نہیں تھے بل کہ یہ اُن کی نگاہ کی نُدرت و گہرائی ہے کہ جس نے اُن کے کلام کو فلسفیانہ سمت دی ہے۔ غزل گوئی میں وہ بے مثال ہیں لیکن قصیدہ گوئی میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ رُباعی میں بُلند پایہ مضامین ادا کیے ہیں۔ غالبؔ نے اُردو زبان و ادب اور شاعری کو بہت بڑی ترقی دی ہے۔ اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں غالبؔ کا نام زندہ جاوید ہے۔

مرزا غالبؔ کو شاعری کا خداداد ملکہ تھا۔ وہ گیارہ سال کی عمر ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے فارسی میں شاعری کرتے تھے جس پر انھیں ناز تھا لیکن بعد میں اُردو میں شاعری کرنے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں کمال حاصل کر لیا اور اُستادِ کامل بن گئے۔ غالبؔ ایک بے مثال شاعر تھے۔ غزل گوئی اُن کا خاص میدان تھا۔ اُنھوں نے جُملہ اصنافِ سُخن پر طبع آزمائی کی، گو انھیں قصیدہ نگاری سے دل چسپی نہ تھی تاہم اُنھوں نے اعلیٰ قصیدے لکھے ہیں۔ غالبؔ ہمہ رنگ قسم کے آدمی تھے۔ وہ کہیں واعظ، کہیں فلسفی، کہیں رند و سرمست اور کہیں موجِ روحانیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قصیدہ گوئی میں گو کہ غالبؔ کو کامیابی حاصل نہ ہوئی پھر بھی اُن کے قصائد اُردو زبان و ادب میں بڑے کام کی چیز ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

مرزا غالبؔ نے یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفرؔ کی شان میں لکھا ہے۔ مرزا کی انفرادیت ایک ایک سے ظاہر ہوتی ہے۔ غالبؔ کے ہاں تمام الفاظ خیالات کے تابع ہیں۔ اِن کے اشعار پہلودار ہیں۔ غالبؔ کے اس قصیدہ میں جدت طرازی ہے جو ہر جگہ فطری اور قُدرتی انداز میں پائی جاتی ہے۔ اِس میں شاعرانہ حقائق نگاری بھی ہے۔ ان کے اشعار ان کے دِلی جذبات و خیالات کے حقیقی عکاس بھی ہیں اور سچی تصویریں بھی۔ غالبؔ کے اشعار احساس و فکر دونوں کے چھیڑتے ہیں اور دونوں کو آسودہ کرتے ہیں۔ اس قصیدہ میں غالبؔ نے انتخابِ الفاظ کا بڑے فنّی طریقے سے کیا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا کیے ہیں۔ ابتذال اِن کے کلام میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ غالبؔ نے

اس قصیدہ میں تشبیہات و استعارات کا استعمال فنّی طریقے سے کیا ہے۔ زبان میں صفائی، سادگی، شیرینی اور شگفتگی ہے۔ سلاست اور روانی ہے۔ زبان و بیان اور فنّی لحاظ سے مرزا غالبؔ کا یہ قصیدہ بلند مرتبت قصیدہ ہے۔ غالبؔ نے بعض ایسے کامیاب قصائد لکھے ہیں جو اُردو شاعری کا سرمایۂ ناز ہے۔ جس کی عمدہ مثال یہ قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ اگرچہ ایشیائی قصیدہ گوئی کے تمام رسمی محاسن سے خالی ہے، لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت اور تشبیب نے اُردو قصیدہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے اور خود نقاد اِس کو تسلیم کرتے ہیں۔

شرح ''ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام''

ہاں مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

تشریح: مرزا غالبؔ فرماتے ہیں کہ اے پہلی تاریخ کے چاند! ہم کو بھی بتا کہ تُو کِس کو ادب سے جھُک کر سلام کر رہا ہے۔ اُس کا نام کیا ہے؟ ماہِ نو جھُکا ہوا ہوتا ہے، گویا کسی کو سلام کر رہا ہے۔ اِسی لیے شاعر ماہِ نو سے اِس طرح پوچھتا ہے۔

دو دِن آیا ہے تو نظر دمِ صُبح
یہی انداز اور یہی اندام

تشریح: دو دِن سے صبح کے وقت اِسی انداز سے بہت باریک اور نازک بدن نظر آتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟۔

بارے دو دِن کہاں رہا غائب؟
بندۂ عاجز ہے گردشِ ایام

تشریح: الغرض یہ تو بتا کہ دو دِن تو کیوں دکھائی نہیں دیا۔ آخر تو کہاں چلا گیا تھا۔ چاند جواب دیتا ہے کہ زمانے کی

گردش نے مجھے آنے نہیں دیا۔ اِس لیے میں مجبور تھا۔

اُڑ کے جاتا کہاں؟ تاروں کا

آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

تشریح: اگر میں بھاگ کر یا اُڑ کر جانا بھی چاہتا تو نہیں جا سکتا تھا کیونکہ چاروں طرف آسمان نے ستاروں کا جال بچھا رکھا تھا، اِس طرح راستے بند تھے۔

عُذر میں تھے دِن نہ آنے کے

لے کے آیا ہے عید کا پیغام

تشریح: اے چاند! تو چوں کہ تین دِن غیر حاضر رہا یعنی غائب رہا اور تین دِن کے بعد حاضر ہوا ہے اِس کی معذرت میں تو عید کی خوشی اور مسرت کا تحفہ لے کر آیا ہے۔

اس کو بھولا نہ کہنا چاہیے

صُبح جو جائے اور آئے شام

تشریح: دُنیا کا عام دستور ہے اگر صبح کا گیا ہوا شام کو واپس آ جائے تو اُسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اِس لیے صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہنا چاہیے۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا

تیرا آغاز اور تیرا انجام

تشریح: اے چاند! تیرے چھپنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تیرا شروع اور تیرا آخر سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو بہادر شاہ ظفؔر کی بارگاہ سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صرف میں نے ہی نہیں بل کہ سب نے یہ راز معلوم کر لیا ہے۔

رازِ دل مُجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟

مُجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام؟

تشریح: تو اپنے دل کا حال مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ کیا تو مُجھے چُغل خور سمجھتا ہے۔ نہیں میں چُغل خور نہیں۔ مُجھ سے تو اپنا راز مت چھپا۔

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں

ایک ہی ہے، اُمید گاہِ انام

تشریح: مجھے معلوم ہے کہ آج دُنیا میں لوگوں کی اُمید گاہ صرف ایک بہادر شاہ کی بارگاہ ہے۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بہ گوش

غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

تشریح: اے چاند! یہ بات مجھے معلوم ہے کہ تو بہادر شاہ ظفر کا غلام ہے۔ لیکن کیا تجھ کو خبر نہیں کہ میں بھی اُسی بادشاہ کا غلام ہوں۔ دراصل ہم دونوں ایک ہی بادشاہ کے غلام ہیں۔

جانتا ہوں، کہ جانتا ہے تُو

تب کہا ہے، بہ طرزِ استفہام

تشریح: مُجھے معلوم ہے کہ تو میری غلامی کا حال جانتا ہے تب میں نے صرف سوال کے طور پر تُجھ سے یہ پوچھ لیا ہے ورنہ مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ!

قرب ہر روز بہ سبیلِ دوام

تشریح: اے چاند بادشاہ کی خدمت میں ہمیشہ پابندی سے ہر روز حاضر ہونے کا فخر تو صرف سورج کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ تجھ کو یہ بات کہاں نصیب؟ کیونکہ تو گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ جب کہ سورج ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا

جُز بہ تقریبِ عید ماہِ صیام

تشریح: غالبؔ فرماتے ہیں کہ اے چاند! تجھ کو یہ رُتبہ اور شرف کہاں سے حاصل ہے کہ ہر روز بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو۔ تُجھ کو یہ عزّت و مرتبہ رمضان کے مہینے کے بعد عید کی تقریب کو حاصل ہوتا ہے۔ ماہِ رمضان کے بعد عید کی تقریب میں تجھے یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اِس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو

پھر بنا چاہتا ہے' ماہِ تمام

تشریح: مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج تُو ہلال (پہلی کا چاند) لیکن اس کے کرم و فضل کی بدولت اب تُو ماہِ کامل بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔

ماہ بن' ماہتاب بن' میں کون؟

مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

تشریح: اے چاند! تُو چاندنی بن، چاند بن، تجھے روکنے والا میں کون ہوں؟ اِس کے عوض میں تُو مجھے کے انعام دے گا؟ تُو بادشاہ سے خواہ کتنا ہی فیض حاصل کر کے چاند یا ماہتاب بن، مُجھے اِس سے کیا فائدہ۔ تُو مجھے کوئی انعام نہیں دے گا۔

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے

اور کے لین دین سے کیا کام

تشریح: میرا اور بادشاہ کا معاملہ تو الگ ہے۔ دُوسروں کے معاملات سے مجھے کیا تعلق ہے؟ اس کی جو خاص عنایت مُجھ پر ہے، اِسے میں ہی جانتا ہوں۔ دوسروں کو اِس کا کیا علم ہے؟

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص

گر تُجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

تشریح: اے چاند! تجھے بادشاہ کی عام عنایت سے فائدہ اُٹھانے کی اُمید ہے لیکن میں بھی اس کی خاص عنایتوں سے مُستفید ہونے کی تمنّا رکھتا ہوں۔

جو کہ بخشے گا تجھے فرّ و فروغ

کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام؟

تشریح: اے چاند! اگر تو بادشاہ کے فیض سے روشنی کی شان پائے گا تو کیا وہ میری ضرورت اور پسند کے مطابق مُجھے سُرخ شراب نہ دے گا۔ جو تُجھے شان دے گا وہ مجھے سُرخ شراب نہ دے گا؟ ضرور دے گا۔

جبکہ چودہ منازلِ فلکی

کر چکے قطع تیری تیزیِ گام

تشریح: اے چاند! جب تُو اپنی تیز رفتاری سے چودہ رات میں آسمان کی چودہ منازل طے کرے اور ماہِ کامل بن جائے۔

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر

کو و مشکوُ و صحن و منظر و بام

تشریح: تیری روشنی سے گلی، کوچہ، شاہی محل، کھلا ہوا صحن اور تمام مناظر روشن ہو جائیں گے۔

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز

اپنی صورت کا ایک بلوریں جام

تشریح: تو اس وقت دیکھنا کہ میرے ہاتھ میں بھی تیرا ہی ہم شکل ایک پیالہ ہوتا اور اس میں سے شراب چھلکتی ہوتی۔ یعنی اگر تُو بادشاہ کے فیض سے فائدہ اُٹھائے گا تو مُجھے بھی شراب ملے گی۔

کہہ چُکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ

اے پری چہرہ! پیکِ تیز خرام

تشریح: اے خوب صورت اور تیز رو چاند! مجھے تو جو کچھ کہنا تھا، وہ میں نے کہہ دیا ہے۔ اب تیری باری ہے۔ تجھے جو کچھ کہنا ہے وہ کہہ دے۔

کون ہے جس کے در پر ناصیہ سا

ہیں مہَ و مہر و زُہرہ و بہرام

تشریح: تو اپنی زبان سے بتا کہ وہ کون ہے، جس کے در پر چاند، سورج، زُہرہ اور بہرام کے تارے سر جھکاتے ہیں اور اُس کے کرم کے آسی بنے رہتے ہیں۔

توُ نہیں جانتا تو مُجھ سے سُن

نام شہنشاہِ بُلند مقام

تشریح: اگر توُ اس عالی قدر بادشاہ کا نام نہیں جانتا تو لے مُجھ سے سُن! میں بتاتا ہوں کہ جو بُلند مرتبہ اعلی مقام رکھنے

والا بادشاہ وشہنشاہ ہے۔

قبلۂ چشم و دِل بہادرشاہ

مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

تشریح: میرے بادشاہ اور ممدوح کا نام بہادرشاہ ہے جس کی طرف ہر ایک کا دل لگا ہوا ہے اور جس کو ہر آنکھ دیکھ رہی ہے۔اس کی ذات سے خداوندِ عالم کا جلال وکمال اور کرم ظاہر ہوتا ہے۔

شہسوارِ طریقۂ انصاف

نو بہارِ حدیقۂ اسلام

تشریح: وہ انصاف کے راستے کا شہسوار ہے اور اسلام کے باغیچے کی تازہ بہار ہے۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز

جس کا ہر قول معنیِ الہام

تشریح: جس کا ہر کام ایک کرشمہ ہوتا ہے اور جس کی ہر بات الہامی معنی رکھتی ہے۔ جو بات بادشاہ کہتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اُس کے دل میں ڈالی گئی ہے۔

بزم میں میزبانِ قیصروجم

رزم میں اُستادِ رسم وسام

تشریح: مجلس میں وہ بادشاہ قیصر وجمشید کا میزبان ہے اور لڑائی میں رستم پہلوان اور اُس کے دادا سام کا بھی اُستاد ہے۔ وہ نہایت مہمان نواز اور عظیم پہلوان و بہادر ہے۔

اکائی نمبر 26:   کلام غالب فکری، سیاسی اور سماجی اثرات کی روشنی میں

ساخت:

سبق کا تعارف

سبق کا ہدف

کلام غالب فکری سیاسی اور سماجی اثرات کی روشنی میں

فکری اثرات

سیاسی اثرات

سماجی اثرات

نمونہ برائے امتحانی سوالات

امدادی کتب

سبق کا تعارف:۔

اسداللہ خان نام اور غالب تخلص 1797ء کو اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ موصوف کو شاعری سے فطری شغف تھا۔ شاعری کے سب سے اہم اور بنیادی عنصر ''تخیل'' میں آپ کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں (جسے اردو کی بوطیقا کہا جاتا ہے) تخیل کو شعر کے لئے لازمی جز قرار دیا ہے۔ اسداللہ خان غالب کی اسی قوت تخیل نے ان کے کلام میں فکری عناصر کی موجودگی کو یقینی بنایا۔ وہ ابھی بچپنے میں تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس سانحے نے غالب کی فکر کو مزید جلا بخشی۔ یعنی والدین کی وفات کے بعد ان کا بچپنہ عام بچپنے سے اوپر اٹھ کر سنجیدگی اور فکری گہرائی سے ممیّز ہو گیا۔ بات کو مزید بڑھانے سے پہلے کلام غالب کے فکری اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

سبق کا ہدف:۔

اس سبق میں ہم مرزا اسداللہ خان کے کلام پر اس وقت نے فکری، سیاسی اور سماجی اعتبار سے جو اثرات مرتب کئے ان کا احاطہ کریں گے۔دوران سبق ہم اس دور کی تہذیب وتمدن کو جاننے کی کوشش بھی کریں گے۔نیز غالب کی تصوف پسندی اور مذہب بیزاری کا ذکر بھی ضمناً آئے گا۔

کلام غالب فکری سیاسی اور سماجی اثرات کی روشنی میں

فکری اثرات:۔ انیسویں صدی کے آغاز میں غالب دلی آئے۔دلی اس وقت ہر اعتبار سے اجڑ رہی تھی۔یہاں تک کہ دلی کی مٹی میں پیدا اور پلنے بڑھنے والے میر تقی میر بھی دلی سے کوچ کر کے لکھنو چلے گئے۔لکھنو نوابوں کا شہر ہونے کے ناطے آسودہ حال تھا۔غالب نے لوٹتی دلی کو دیکھا۔ہر شخص پریشان حال تھا۔اس پریشانی نے غالب کی فکر پر گہرا اثر ڈالا۔انہوں نے اس پورے پریشان زدہ ماحول کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔موصوف کی ابتدائی شاعری عوامی سمجھ سے باہر تھی۔اس کی ایک وجہ غالب کے ہاں تراکیب اور اصطلاحات کا مشکل استعمال تھا۔دوسری ان کی شاعری میں فکری گہرائی کا تناسب زیادہ تھا۔ان کی فکر کو مذہب نے ،عقیدہ نے،سیاسی و سماجی حالات نے،انسانوں کے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں نے غرض کہ ہر رونما ہونے والے عمل نے بہت متاثر کیا۔غالب چونکہ حساس ذہن کے مالک اور طبعی شاعر تھے۔اس لئے انہوں نے ایسے تمام عوامل کا سنجیدگی سے مشاہدہ کیا اور اردو شاعری کو ایک نئی فکر سے ہم کنار کیا۔

غالب تیرہ برس کی عمر میں دلی وارد ہوئے۔اس سے تین سال پہلے وہ دلی کے داماد بن چکے تھے۔غالب جب دلی آئے تو اس وقت میر تقی میر کی وفات کو تین سال ہو چکے تھے۔ان کی وفات 1810ء میں لکھنو میں ہوئی تھی۔یہ کہا جاتا ہے کہ غالب نے اپنی ابتدائی غزلیں میرؔ کو دکھائیں اور میرؔ نے اصلاح بھی کی ،لیکن بعد کی تحقیق نے اس مفروضے کو رد کر دیا۔البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ میر کی شاعری نے غالب کے لاشعور میں ضرور اپنے اثرات مرتب کئے ہوں گے۔غالب کی آمد دلی کے وقت دلی میں شیخ ابراہیم ذوق کا طوطی بول رہا تھا۔انہیں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ذوق کسی دوسرے شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کے مداح بھی کسی اور کو قبول کرنے پر بالکل راضی نہ تھے۔ذوق کے اس رویے اور ان کے مداحوں کی بے جا عقیدت نے غالب کی فکری حس کو

تحریک دی۔انھوں نے کہا

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

اس شعر میں سیدھا وار شیخ ابراہیم ذوق ہی پر ہے۔پھر ذوق اور غالب کے ادبی معرکوں نے بھی غالب کو فکری اعتبار سے بہت متاثر کیا۔

فکری اعتبار سے غالب کی زندگی میں تیسرا اہم کردار ان ہی تین بڑے ادبی معرکوں کا ہے۔پہلا جو کلکتہ میں قتیل کے حامیوں کے ساتھ ہوا۔دوسرا شیخ ابراہیم ذوق کے ساتھ دہلی میں اور تیسرا ''قاطع برہان'' کا معرکہ۔پہلے معرکہ کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

دراصل غالب کلکتہ پنشن کی غرض سے گئے تھے۔وہاں پر مرزا افضل بیگ پہلے سے موجود تھے۔وہ غالب کے بہت پہلے سے سخت مخالف تھے۔افضل بیگ دہلی کے بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے وکیل بھی تھے۔انہوں نے کلکتہ میں قتیل کے حامیوں کے بتایا کہ غالب قتیل کے کلام کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتے۔یہ بات سنتے ہی قتیل کے حامی بھڑک اٹھے۔یہی نہیں افضل بیگ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھی اچھا خاصہ اثر رسوخ رکھتے ہیں۔انہوں نے کمپنی میں غالب کے حوالے سے یہ شکایت درج کی کہ ان کے دو نام ہیں، غالب اور اسد۔یہ موقع کی مناسبت سے اپنے ناموں کا استعمال کر کے سرکاری مراعات کا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔غالب کی ذات پر افضل بیگ کی جانب سے تیسرا بڑا حملہ یہ کیا گیا کہ وہ سنیوں کے لئے کٹر رافضی ہیں اور شیعوں سے کہا کہ غالب صوفی یا ملحد ہیں۔باوجود اس پروپگنڈے کے کلکتہ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں غالب نے اپنی دو غزلیں پڑھیں۔اور انہی کے بقول ''خدا نے ان کے حال پر بڑا کرم کیا'' علاوہ ازیں غالب پر بہت سے ادبی الزامات لگائے گئے جو معقول نہ تھے۔افضل بیگ کی ان حرکتوں کا بڑا مقصد غالب کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر میں زیر کرنا تھا تا کہ وہ پنشن حاصل نہ کرسکیں۔بظاہر اس سانحے اور ادبی معرکے کا غالب کی ذات پر تو کوئی اثر نہ پڑا لیکن غالب کی فکر اس پورے واقعے نے جنجھوڑ کر رکھ دیا۔افضل بیگ کی شدید اور کھلی مخالفت نے غالب کے باطن کو نالاں کیا۔اور اس سے غالب کی فکر میں سنجیدگی سے بھرا نیا موڑ آیا۔

دوسرے معرکے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ 1852ء میں جب زینت محل کی فرمائش پر غالب نے جوان بخت کا سہرا لکھا تو مقطع میں کہا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

محمد حسین آزاد کے مطابق اس مقطع میں بادشاہ کے استاد پر چوٹ تھی۔اس لئے بہادر شاہ ظفر نے شیخ ابراہیم ذوق سے سہرا کہلوایا۔ذوق نے سہرا کہا مقطع تھا

جن کا دعوی ہے سخن کا یہ سنادو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

کہا جاتا ہے کہ بعد میں مرزا غالب نے بارہ اشعار کی ایک غزل کہہ کر بادشاہ ظفر سے معافی طلب کی۔معافی طلب کرنے یا سمجھوتے کرنے کا راست تعلق انسانی سوچ سے ہے۔سوچ اور فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اس لئے ایسے واقعات سے فکر کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔

غالبؔ کا تیسرا ادبی معرکہ فارسی کی لغت ''برہان قاطع'' کے تعلق سے تھا۔فارسی کی یہ لغت محمد حسین برہان نے سلطان عبداللہ قطب شاہ والئی سلطنت گولکنڈہ کے ایماء پر حیدرآباد دکن میں مرتب کی تھی۔انہوں نے اس لغت کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس میں بہت سی اغلاط پائیں۔غالب چونکہ ہندوستان میں اپنے آپ کو سب سے بڑا فارسی کا عالم سمجھتے تھے ،کسی اور کو خاطر میں نہ لاتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے جواب میں ''قاطع برہان'' لکھ ڈالی۔اس پر فارسی دانوں کا زبردست ردعمل سامنے آیا جو فکری اعتبار سے غالب کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔

غالب مرزا بیدل کی فکر اور اسلوب سے بھی متاثر تھے۔رفتہ رفتہ انہوں نے بیدل کے طرز اور اسلوب سے کنارہ اختیار کیا لیکن بیدل کی فکری فضا سے غالب اپنا دامن نہ چھڑا پائے۔بیدل کے علاوہ ولی اللہ مکتب فکر نے بھی غالب کو متاثر کیا۔دلی کے عبوری دور کی فکری فضا جس نے غالب کی فکر کو مزید متاثر کیا کا نقشہ شبیر احمد خاں غوری نے یوں کھینچا ہے۔

''استمداد و توسل:۔ اولیائے کرام سے شفاعت یا مدد طلب کرنا

حرف ندا:۔ مشکل کے وقت یا محمد، یا علی، یا معین الدین کہنے کا رواج تھا۔

مولود اور اس میں قیام:۔ مسلمان اس کے قائل اور مصلحین اس کے خلاف تھے۔

عرس منانا، امتناع النظیر ،ان رسوم کو غالب نے اپنی مثنوی ششم میں تبصرے کے لئے منتخب کیا تھا۔

ایک اور بڑا عنصر غالب کی فکر کو متاثر کرنے والا تصور تشکیک تھا۔شک کرنے کا وصف انسانی فطرت میں شامل ہے۔انہوں نے شک کے زائیدہ تصور وجود، اعیان، امکان اور اشراق پر کھل کر لکھا ہے۔مثلاً

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوتھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

فکری اعتبار سے غالب کو متاثر کرنے والا ایک اہم نام مولانا فضل حق خیرآبادی کا ہے۔غالب ان کو بہت مانتے تھے اور وہ بھی غالب کو جی جان سے چاہتے تھے۔مولانا صوفی منش آدمی تھے۔ان کی مجالس میں اکثر تصوف پر باتیں ہوتیں جو غالب کے شعور کا حصہ بنتی جاتیں۔غالب کے اشعار میں جو تصوف کی بحث ملتی ہے اس میں فضل حق خیرآبادی کا اہم کردار ہے۔غالب نے اپنے اشعار میں اکثر وحدت الوجود کے فلسفہ کو بیان کیا ہے۔اس فلسفہ کے بانی شیخ محی الدین ابن عربی (شیخ اکبر) ہیں۔اس فلسفہ کے پیروکار وجودی کہلاتے ہیں۔متذکرہ فلسفہ کے کچھ عرصے بعد تصوف کے ایک اور فلسفہ نے جنم لیا جسے ''وحدت الشہوذ'' کہا جاتا ہے۔اس فلسفہ کے بانی شیخ مجدد الف ثانی (شیخ سرہندی) ٹھہرے اور اس فلسفہ کو ماننے والے شہودی کہلاتے ہیں۔غالب کے وجودی ہونے کی دلیل میں ان کے کچھ اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اسے کون دیکھ سکتا ہے وہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

متذکرہ بالا آخری شعر میں غالب نے پورے کائناتی فلسفے کو سمیٹ دیا ہے۔ کہ اصل وجود کی سزاوار تو صرف مالک حقیقی کی ذات ہے۔ باقی تمام کائنات اس کی مخلوق ہے، یا افلاطون کے لفظوں میں اصل کی نقل ہے یا ارسطو کے مطابق اصل کی نقل کی نقل ہے، تو پھر حیرانگی اس بات کی کہ ہم مشاہدہ کس بات کا کریں۔ یہ شعر وحدت الوجود کے فلسفہ کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ غالب کا عہد مذہبی اعتبار سے بہت مظبوط تھا۔ خانقاہوں کا کلچر عروج پر تھا۔ غالب جیسا حساس اور جدت طبع شاعر اس کلچر سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ لہذا عوام اور خواص کے ان کارناموں نے غالب کی فکر پر اپنے اثرات مرتب کیئے وہ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ لوگوں کی عقیدت کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اس شعر میں غالب نے پہلے سے موجود تصور کی تخریب آوری Deconstruction کی ہے۔ یعنی یہ کہ عام تصور کے مطابق بت پرست شخص جہنم کا حقدار تھا۔ لیکن غالب نے اس تصور کو چیلنج کیا اور کہا کہ صرف قول کے اعتبار سے کوئی شخص جنت وجہنم کا حقدار نہیں ہوسکتا بلکہ یہ فیصلہ عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ہوگا۔ اس عمل میں انہوں نے وفاداری کو مقدم ٹھہرایا اور کہا کہ یہ مت دیکھا جائے کہ برہمن نے پوری زندگی بت پرستی کی لہذا وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا بلکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے عمل میں کتنا وفادار رہا۔ یہاں تک کہ اس میں پوری عمر اسی وفاداری میں گزار دی اور موت

بھی اسے اسی بت خانے میں آئی ۔لہذا ان انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے جلایا نہ جائے بلکہ کعبے میں گاڑا جائے۔غالب کواس قسم کی فکری تحریک اور وقت کے مذہبی سماج سے ہی ملی تھی۔

بعدازاں ان کے اسی فکری جذبے نے لوگوں کوانہیں فلسفی شاعر کہنے پر آمادہ کیا۔چند ناقدین نے غالب کوفلسفی شاعر یا شاعر فلسفی ماننے سے کھلا انکار کر دیا اور اسے ایک غیر ضروری امر قرار دیا۔تاہم غالب کے فکری تجسس اور جہان معنی کا سراغ لگانے سے وہ اپنی آپ کو بچانہ پائے۔غالب کے فکری مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کے بحیثیت غالب ہی پڑھا جائے۔یعنی غالب بحیثیت فلسفی،شیعہ،سنی،مجتہدوغیرہ نہ کہہ کر ہم غالب کوسمجھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

انورمعظم اپنی کتاب ’’غالب کی فکری وابستگیاں‘‘میں غالب کوسب سے بڑا لفظ آگاہ قرار دیتے ہیں۔اس آگہی کے پیچھے غالب کی فکری حس ہی کارفرما ہے۔انہوں نے لفظ کو’’گنجینہ معنی کا طلسم‘‘ کہہ کراپنی کلام میں معنوی وفکری تہہ داریوں کی گنجائش نکالی ہے۔یعنی یہ کہ ہر زمانے کا قاری غالب کے شعر کا مفہوم اپنی فکر کی اعتبار سے پیش کرتا ہے۔غالب کی فکر پراس وقت کے ماحول نے جواثرات مرتب کئے انہوں غالب کوسخنور بنادیا۔سخنوری کے اعتبار سے ہم مولانا فضل حق خیرآبادی کا یہ قول رقم کرکے اس بحث کوسمیٹتے ہیں۔

> ’’مولانا (فضل حق خیرآبادی) کے شاگردوں میں سے ایک شخص ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزاصاحب سے جاکر پوچھے۔انہوں نے کچھ معنی بیان کیے۔اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا۔آپ مرزاصاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں،آج انہوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اس کے معنی کہے تھے،بیان کیے۔مولانا نے فرمایا،پھران معنوں میں کیا برائی ہے۔؟اس نے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو،مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جومرزا نے سمجھے ہیں تواس نے سخت غلطی کی۔‘‘

(خواجہ الطاف حسین حالی،یادگارغالب،صفحہ نمبر 180،لاہور،شیخ مبارک علی اینڈ سنز،1930ء)

سیاسی اثرات:۔

سیاست انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔کوئی بھی شخص کلی طور پر غیر سیاسی نہیں ہوسکتا۔مرزا اسداللہ خان غالب کا دور انتہائی پر آشوب تھا۔جس کی ذمہ دار اس وقت کی سیاست ہی تھی۔مغلیہ سلطنت دن بدن زوال پزیر ہوتی جا رہی تھی۔اس کا آغاز اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔انگریزی حکومت اپنے سیاسی بازو پوری مضبوطی سے پھیلا رہی تھی۔غالب کی ولادت دو صدیوں کا سنگم ہے۔یعنی اٹھارویں صدی کا اختتام اور انیسویں صدی کا آغاز۔غالب جب دلی وارد ہوئے تو سیاست نے دلی کو ویران کر رکھا تھا۔ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول تھا۔ہر شخص پریشان حال تھا۔اس دور کی بہترین عکاسی میر تقی میر کے کلام میں ملتی ہے۔میر جب دلی کے حالات سے مایوس ہو کر لکھنو پہنچے تو لکھنو کے منچلوں نے میؔر پر پھبکیاں کسیں۔میر ان کے اس رویے سے سخت نالاں ہوئے اور اپنا تعارف اس طرح کروایا:

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پکار کر
دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میؔر کے ان اشعار میں دلی کے اس وقت کی پوری ترجمانی ملتی ہے۔نشان خاطر رہے کہ میر اپنی عمر کے آخری ایام میں لکھنو گئے تھے۔یہی وقت غالب کا دلی میں قدم رکھنے کا ہے۔غالب نے جب ان حالات کا مطالعہ کیا تو انہیں ہر طرف اتھل پتھل نظر آئی۔ہر کوئی زندگی سے پریشان نظر آیا۔یہ پریشانی سیاست نے پیدا کر رکھی تھی۔گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ یوں تو نادر شاہ اور مرہٹوں کے حملوں کے بعد دہلی میں شعر و شاعری کی محفلیں سرد ہو گئی تھیں،لیکن سیاسی اور معاشی ابتری کے باوجود محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں اردو نے کچھ ایسا سنبھالا لیا کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دہلی میں بیسیوں باکمال شاعر جمع ہو گئے تھے۔ان میں شیخ امام بخش شہبائی، شیخ ابراہیم ذوق،نواب مصطفیٰ

خان شیفتہ، مرزا اسداللہ خان غالب جیسے شعرا شامل تھے۔ غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مختلف شارحین نے اس شعر کی الگ الگ تشریح کی ہے۔ ان تمام تشریحوں میں ایک چیز مشترک ملتی ہے کہ غالب نے اس شعر میں زندگی کی بے ثباتی کو موضوع بنایا ہے۔ یہ بے ثباتی وہی تھی جن نے دلی کو مضطرب کر رکھا تھا۔ انگریزوں کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ظلم بھی آئے دن مضبوطی حاصل کر رہا تھا۔ پرانی دہلی کا علاقہ چاندنی چوک اس ظلم کا مرکز تھا۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ وہاں پر انگریزوں کی جانب سے ہندوستانیوں کو مار کر درختوں پر ان کے سر لٹکائے گئے تھے۔ غالب نے اس چوک کا نقشہ یوں کھینچا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

یا پھر دہلی کے نوابوں کا معیار کیا تھا اس کو غالب کے اس شعر کی روشنی میں جانا جا سکتا ہے

بادشاہی کا جہاں ایسا حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

غالب کے ایسے اشعار سیاسی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب بادشاہوں کے دربار میں شاعروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ خود بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شیخ ابراہیم ذوق موجود تھے۔ ہر شاعر بادشاہ کی تعریف کرتا تھا۔ اس روایت سے غالب بھی اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ دراصل اس وقت کے سیاسی حالات ہی ایسے تھے جو ہر شاعر کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ بقول غالبؔ۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی سے گلہ کرے کوئی

کلام غالبؔ پر سیاسی اثرات کی نشاندہی میں اس واقعہ کی اہمیت مسلم ہے۔ مرزا غالب دہلی سے باہر کسی شہر میں صرف دو بار گئے۔ شہر کا نام کلکتہ ہے۔ آپ پنشن کی غرض سے وہاں گئے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال

تھی۔اسٹرلنگ صاحب جو ہندوستانی سرکار کے اسکریٹری تھے نے مرزا کو اچھی شان دینے کا یقین دلایا۔مرزا غالب نے ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھ ڈالا۔یہ قصیدہ ان کے فارسی کلام کے کلیات میں شامل ہے۔اسٹرلنگ صاحب کا وعدہ وفا نہ ہوا۔مرزا نے مایوسی کے بعد پھر ولایت میں اپیل کی لیکن وہاں بھی بات نہ بنی۔پنشن کے مشن میں تو مرزا کامیاب نہیں ہو پائے البتہ اس واقعے نے ان کے کلام میں سیاسی عناصر کی مداخلت کو یقینی بنا دیا۔پھر ایک وقت آیا جب 1857ء کا غدر رونما ہوا۔یہ ہندوستانیوں کے ناکام جنگ آزادی تھی۔اس کے ہندوستانیوں پر ظلم وستم کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوا۔غالب نے ان حالات کو اپنے کلام بالخصوص دستنبو میں بیان کیا۔دستنبو کی حیثیت سیاسی اور تاریخی اعتبار سے مسلم ہے۔اگرچہ اس ہنگامے کے بعد غالب کا اپنا گھر محفوظ رہا لیکن جو قیمتی سامان اور زیورات ان کی بیگم نے میاں کالے خان کے گھر رکھوائے تھے انہیں ولایتی فوج نے لوٹ لیا۔کچھ گورے مرزا کے گھر میں بھی داخل ہوئے۔انہیں گرفتار کر کے کرنیل برن کے سامنے پیش کیا گیا۔پوچھ تاچھ کے بعد مرزا کو چھوڑ دیا گیا۔غدر کے چند ماہ بعد ہی غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک قصیدہ ''شماریافت روزگار یافت'' لکھا۔یہ قصیدہ نومبر 1858ء میں دستنبو کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپوایا گیا۔دستنبو کے چند نسخے خاص اہتمام سے تیار کر کے ہندوستان اور انگلستان کے اکابر کو بھجوائے گئے۔انگریزوں کے تعلق سے غالب کا نرم رویہ کچھ مصلحتوں کی وجہ سے تھا۔لیکن غدر کے بعد دہلی والوں اور خاص کر مسلمانوں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ان سے غالب کو دلی تکلیف ہوئی۔انہوں نے اس مظلومیت اور بے بسی کا اظہار اپنے ایک قطعہ میں کیا۔

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک

تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کیا کہے باہم
ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب
کیا مٹے گا دل سے داغ ہجراں کا

ان حالات نے غالب کو اتنا افسردہ کر دیا تھا کہ یہ افسردگی ان کی شاعری کا اہم جز بن گئی۔اگرچہ ان کے ہاں افسردگی دائمی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ جلد ہی ایک امید کی فضا قائم ہو جاتی ہے تاہم اس پریشانی کے احساس سے انکار ممکن نہیں۔مثلاً ان کا یہ شعر

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یا

بس کہ ہوں غالبؔ!اسیری میں بھی آتش زیر پا
موے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

شاعری کے علاوہ غالب کے خطوط میں بھی سیاست کے کارن مچی افراط تفریط کے اثرات مل جاتے ہیں۔اسی لئے اٹھارہ سو ستاون کے غدر کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لئے غالب کے خطوط کا سہارا لیا جاتا

ہے۔انہوں نے اپنے خطوط میں شہر دہلی کے بہت سے واقعات کو بیان کیا ہے۔موصوف کے ایک خط جوانہوں نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے سے ایک اقتباس رقم کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

''برسات کا نام آ گیا۔سو پہلے تو مجملاً سنو، ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبا کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔آج اکیسواں دن ہے۔آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔مبالغہ نہ سمجھیے ہزار ہا مکان گر گئے۔سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا اناج پیدا نہ ہوا، یہ پن کال ہے۔''

سماجی اثرات:۔

فرد سماج کی اکائی ہے۔بہت سے افراد مل کر ایک سماج تشکیل دیتے ہیں۔وہی سماج پھر ہر فرد کو متاثر بھی کرتا ہے۔شاعر بھی سماج کا زائیدہ ہی ہوتا ہے۔اس نے اسی سماج میں جنم لیا ہوتا ہے۔اسی تہذیب کے زیرسایہ اس کی پرورش اور نشونما ہوتی ہے۔مرزا غالب کے سماج اولاً تو خوشحال تھا۔غالب کے والد عبداللہ بیگ خان پہلے آصف الدولہ کے پاس لکھنو میں ملازم رہے۔پھر حیدرآباد چلے گئے۔جہاں نظام الملک میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انہیں سو سوار کا افسر مقرر کر دیا۔وہ اس نوکری کو چھوڑنے کے بعد آگرہ چلے گئے۔پھر وہ راج گڑھ میں ایک لڑائی کے دوران مارے گئے۔وہیں ان کی قبر بنی۔اس وقت غالب کی عمر پانچ برس تھی۔یہ 1803ء کا واقعہ ہے۔رفتہ رفتہ یہ خوشحالی جاتی رہی۔مرزا نصراللہ بیگ کی وفات 1806ء کے بعد نواب نے مرزا کی پنشن میں غالب کی دس ہزار روپے طے کر کے اسے پانچ ہزار کر دیا۔اس میں بھی دو ہزار کا حصہ خواجہ حاجی نامی ایک شخص کا قرار پایا۔یہ غالب کی زندگی میں تنگ دستی کا

آغاز تھا۔ جس کی بنیاد اس وقت کا سماج بنا۔ سماج کے ان دونوں پہلوؤں نے غالب کے شخصیت و کلام کو بہت متاثر کیا۔ بچپنے میں والدین کے سایہ سے محرومی، چچا کی موت اور پھر کم عمری کی شادی نے غالب کو وقت سے پہلے بالغ کر دیا تھا۔ اس بلوغت کے ساتھ انسان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ غالب جیسا حساس شخص سماج کے نیرنگیوں سے کیسے دور رہ سکتا تھا۔ وہ جب دلی آئے تو نادرشاہی اور مرہٹی حملوں مچی تباہی کے نرغے سے دہلی آہستہ آہستہ نکل رہی تھی۔ ہر طرف آسودگی لوٹ رہی تھی۔ عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جا رہا تھا۔ انصاف کی فراہمی کو قدرے یقینی بنایا جا رہا تھا۔ نیز عوام کو ان کے حقوق کی جانکاری بھی فراہم کی جا رہی تھی۔ یہ ساری عناصر غالب کے کلام میں کارفرما ہیں۔ مثلاً:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے درد کی دوا کرے کوئی

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ سارے اشعار غالب پر مرتب سماجی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا تیسرے شعر میں غالب نے ایک جانب اپنا حال بیان کیا ہے اور ساتھ ہی دلی کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ دلی میں مچی شورش نے ہر شخص کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا بازار گرم تھا۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کے فراق میں تھا۔ کچھ جانباز موت کو گلے لگانے کے لئے تیار تھے۔ کئی ایک مصلحت کا سہارا لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ کا شعار منافقت اور بزدلی بن گیا تھا۔ مرزا غالب کا شمار مصلحت پسند لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

سبق کا خلاصہ:۔

غالبؔ دلی میں آئے تو یہاں پر ان کے مختلف لوگوں سے سابقہ پڑا جن میں مشائخ بھی تھے حکما، علما اور شعرا بھی تھے۔ مشائخ میں شاہ غلام علی، مولانا احمد فخر الدین، حضرت سید احمد، حکما میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم حسن محمد خاں، حکیم غلام نجف خاں، علمائے دیں میں شاہ عبدالعزیز، مولانا محمد صدرالدین خاں، مولانا فضل حق، شاہ رفیع الدین، مولانا محمد اسماعیل، اور مولانا نذیر حسین، شعراء میں نواب محمد ضیا الدین، احمد خاں رخشاں و نیر، میر نظام الدین ممنون، شاہ نصیر، ذوق، مومن، صہبائی اور شیفتہ وغیرہ شامل تھے۔ غالب کو ان تمام شخصیات نے اپنے اپنے طور پر متاثر کیا۔ ذوق کا بالخصوص ڈنکہ بج رہا تھا۔ ان کے چاہنے والوں کا حلقہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ باوجود غالب کے اچھا شاعر ہونے کے انہیں کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ دلی اور اہل دلی کے اس رویے نے غالبؔ کو بہت رنجیدہ کیا۔

نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ غالبؔ فکری اعتبار سے کن لوگوں سے متاثر ہوئے۔؟

سوال نمبر 2:۔ غالبؔ کے کلام پر سماجی اثرات کی نشاندہی کیجیے۔؟

سوال نمبر 3:۔ غالبؔ کے کلام میں سیاسی اثرات سے کیا مراد ہے۔ مثالوں سے سمجھایئے۔؟

سوال نمبر 4:۔ غالبؔ کی کلام کی فکری سیاسی اور سماجی جہتوں پر ایک مختصر نوٹ لکھیے؟۔

امدادی کتب:۔

1 احوال غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد علیگ، انجمن ترقی اردو ہند، جون ۱۹۵۳ء

2 یادگار غالب، مولانا الطاف حسین، ایوان غالب، نئی دہلی، سال اشاعت ۲۰۱۴ء

اکائی نمبر 27 غالب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات

ساخت:

سبق کا تعارف

سبق کا ہدف

غالب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات

نمونہ برائے امتحانی سوالات

امدادی کتب

سبق کا تعارف:۔

مرزا اسداللہ خان غالب نے ویسے تو بحیثیت شاعر اپنا لوہا منوایا۔فارسی اور اردو کے حلقوں میں اکثر انہیں اسی روپ میں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔لیکن غالب کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان کی خوبصورت نثر سے واضح ہوتا ہے۔گرچہ انہیں نے فارسی نثر لکھی لیکن اردو میں ان کی جانب سے لکھے گئے خطوط اس کی بہترین مثال ہیں۔غالب نے اردو خطوط کا سلسلہ 1848ء کے آس پاس شروع کیا۔ان کے اردو خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ایک ''عود ہندی'' دوسرا ''اردو معلیٰ''۔منشی شیو نارائن آرام نے ''عود ہندی'' کے خطوط کو مرتب اور شائع کرنے کی اجازت مانگی تو مرزا اسداللہ خاں غالب نے پہلے صاف منع کر دیا۔بعد میں مرزا دوستوں کے اصرار پر راضی ہو گئے۔ادھر جب کچھ نا معلوم وجوہات کی بنا پر عود ہندی کی اشاعت میں دیری ہونے لگی تو دہلی میں غالب کے چاہنے والوں نے ''اردو معلیٰ'' کے نام سے ان کے خطوط کا نیا مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ لیا۔اس مجموعے کی اشاعت غالب کی وفات کے بعد ہوئی۔متذکرہ مجموعے کا دیباچہ میر مہدی مجروح اور خاتمہ میرزا قربان علی بیگ سالک نے تحریر کیا۔اس کے علاوہ غالب کے خطوط کے کچھ متفرق مجموعے بھی شائع ہوئے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ نادر خطوط غالب:۔ مولوی کرامت علی ہمدانی ،صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کے نام لکھے گئے خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔

۲۔ مکاتیب غالب:۔ والیان ریاست رام پور کے نام بھیجے گئے خطوط اس مجموعہ کے نام سے شائع ہوئے۔

۳۔ نادرات غالب:۔ یہ بنی بخش حقیر کے نام بھیجے گئے 74 خطوط کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں صرف پہلا خط فارسی کا ہے۔باقی سب اردو خطوط ہیں۔

سبق کا ہدف:۔

اس سبق میں ہم غالب کے خطوط کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔اردو نثر میں ان کے مقام کا تعین کیا جائے گا۔نیز ان کے اسلوب نگارش پر بھی روشنی دالی جائے گی۔

غالب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات

خطوط غالب سے پہلے اردو نثر میں دو قسم کے اسلوب رائج تھے۔

1۔ ایک سادہ اور عام فہم اسلوب جس کی مثال میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر شائع ہونے والی کتابیں پیش کی جاتی ہیں۔ایسی کتابوں میں میر حسن کی باغ و بہار اپنے سلیس اور رواں اسلوب کے کارن سرفہرست ہے۔

2۔ دوسرا اردو کا مقفی اور مسجع اسلوب رائج تھا۔اکثر اہل قلم کے نزدیک عالمانہ انداز تحریر یہی مانا جاتا تھا۔یعنی معمولی باتوں کو استعاراتی یا تمثیلی انداز میں پیش کرنا۔رجب علی بیگ کا فسانہ عجائب والا مشکل،مقفی اور مسجع اسلوب اس کی بہترین مثال ہے۔۔فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ سرور نے باغ و بہار پر بات کرتے ہوئے میر حسن پر سخت پھبکیاں کسی ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں کہ میر حسن نے دلی کے محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔بہر حال غالب نے اپنے خطوط میں ایک نیا نثری طرز ایجاد کیا۔انہوں نے روایتی القاب کے استعمال سے منہ موڑا۔سیدھے سادھے انداز میں مطلب کی بات کہہ کر وہ اپنے خط کو مکمل کرتے ہیں اور پھر مکتوب الیہ کو ارسال کر دیتے ہیں۔ان کے خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ کسی کو خط نہیں لکھ رہے بلکہ سامنے بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں۔اسی خصوصیت کی بنا پر انہوں نے کہا کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔یعنی میرے خطوط پڑھتے ہوئے ہر شخص کو یہ گمان گزرتا ہوں کہ میں

مکتوب الیہ (جس کو خط لکھا جا رہا ہو) کو سامنے بٹھا کر بات چیت کر رہا ہوں۔اس کے علاوہ غالب نے اپنے خطوط میں زندگی اور دہلی کے نجی حالات کو بھی رقم کیا ہے۔ان حالات رقم کرنے کے موجب ہی ان کے خطوط کی تاریخی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔وہ اپنے ہر خط کت اختتام پر تاریخ بھی رقم کرتے تھے۔جس سے خط کے زمانے کے تعین بآسانی ہوسکتا ہے۔طنز و ظرافت اور حقیقت بیانی بھی غالب کے خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے۔مقفی و مسجع عبارتیں ،سہل پسندی،اختصار،جدت طرازی،منظرکشی،جزئیات نگاری،اوران کے اشعار کی تشریح بھی غالب کے خطوط کی خصوصیات ہیں۔اب ہم فرداً فرداً ان خصوصیات کا تفصیل میں جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ اشعار کی تشریح:۔

غالب کے خطوط کی بنیادی اور اہم خصوصیت ان کے اشعار کی تشریح ہے۔اس وقت غالب کے شعر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور وہ پھر غالب سے ان کی تشریح کا استفسار کرتے تھے۔غالب اپنے خطوط کے ذریعہ لوگوں کے اس اصرار کو پورا کر کے ان تک پہنچاتے تھے۔درج ذیل اشعار کی تشریح غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔

تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یا رب
تیرا بھی سینہ نسمل سے پر افشاں نکلا

یک الف بیش نہیں صقیل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

حسن اور اس پہ حسن ظن،رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے،غیر کو آزمائے کیوں

مندرجہ بالا اشعار کو لے کر لوگوں کو بہت سے شبہات تھے۔ان شبہات کو دور کرنے کے لئے غالب نے اپنے خطوط میں اپنے اشعار کی تشریح لکھ بھیجی۔اپنے خطوط ہی میں غالب نے شعر کہنے سے عاری ہونے کی وضاحت بھی کی۔ مثلاً اپنے دوست چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں،دل چاہیے دماغ چاہیے،ذوق چاہیے،امنگ چاہیے،یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں،چونسٹھ برس کی عمر ولولہ شباب کہاں؟۔رعایت فن،اس کے اسباب کہاں،انا للہ وانا الیہہ راجعون''

اس کمی کا اعتراف غالبؔ اپنے ایک شعر میں بھی کرتے ہیں۔شعر یوں ہے۔

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اس میں دم کیا ہے

مختصر یہ کہ اپنے اشعار کی تشریح مختصر لفظوں میں غالب کے خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

۲۔القاب کا خاتمہ:۔

غالب نے اپنے خطوط میں مکتوب الیہ کو القاب سے کبھی نہیں نوازا نہ ہی القابات کے ذریعہ وہ اس سے مخاطب ہوتے ہیں۔انہوں نے سیدھے اور صاف انداز میں اپنے خطوط کا آغاز کیا ہے۔ان کا میں فوکس اپنے اہم مقصد کے اظہار پر رہتا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی کے الفاظ میں ''مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت کا یہ انداز اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہوئی''۔وہ خط کو میاں،کبھی برخودار،کبھی مہاراج،کبھی بھائی اور کبھی کسی اور مناسب لفظ کے استعمال سے شروع کرتے ہیں۔اسی بے تکلفی اور سادگی ان کے خطوط میں ڈرامائی انداز پیدا کر دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے خطوط سے دو ایک مثالیں دیکھیے۔

''کوئی ہے،ذرا یوسف مرزا کو بلائیو،لو صاحب وہ آئے ''

یا مرزا تفتہ نے خط کا جواب لکھنے میں دیر کردی تو غالب گویا ہوئے۔

''کیوں صاحب،کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کے خط نہ لکھیں؟۔اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا،کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے''۔

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

''او میاں سید زادہ آزادہ،دلی کے عاشق دلدادہ،ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے،حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے،نہ دل میں مہر و آزرم،نہ آنکھ میں حیا و شرم''

غالب کے اسی بے تکلفانہ اور سادہ انداز نے ان کے خطوط کو مشہور کر دیا۔ان کا یہی اسلوب آگے چل کر جدید اردو نثر کے فروغ میں سنگ میل قرار پایا۔

۳۔مراسلہ سے مکالمہ:۔

غالب کے خطوط کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مکالماتی انداز اختیار کیا۔ان کے خطوط کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہوں۔خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔غالب کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت یہ مفروضہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔یہاں تو پوری ملاقات کا سماں بندھتا نظر آتا ہے۔غالب نے خود کہا ہے کہ میں نے خط لکھنے کا نیا طرز ایجاد کیا یعنی مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔مثلاً میرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں۔

''میرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ہزار کوس سے بزبان باتیں کیا کرو۔ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''۔

یا

''بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کاہے کو ہے۔مکالمہ ہے''۔

مرزا کے اس انداز کو مزید سمجھنے کے لئے ان کا ایک پورا خط یہاں بطور مثال رقم کیا جاتا ہے۔منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھتے ہیں

''بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔آپ کا ہاتھرس سے کول آجانا ہم کو معلوم ہو گیا تھا۔ہمارا ایک واقعہ نگار اس ضلعے میں رہتا ہے۔حق تعالیٰ اس کو جیتا رکھے۔گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو،اس ساٹھ برس میں یہ لو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔چھٹی ساتویں رمضان کو مینہ خوب برسا۔ایسا مینہ،جیٹھ کے

مہینے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔اب مینہ کھل گیا ہے۔ابر گھرا رہتا ہے۔ ہوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر رک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔ جے پور کا حال آپ کو منشی صاحب کے اظہار سے یا ان کے نام کے خطوط دیکھ کر معلوم ہو گیا ہے۔ مکرر کیوں لکھوں۔ خیر غنیمت ہے۔ یہ کیا فرض تھا کہ ہم جو چاہتے وہی ہوتا۔''

۵۔طنز و ظرافت:۔

غالب کی حس ظرافت بلا کی تھی۔ انہی اسی خصوصیت کی بنا پر مولانا الطاف حسین حالی نے انہیں حیوان ظریف کہا۔ غالب نے طنز و مزاح میں جدت سے کام لیا ہے۔ ان کے مزاق عام مزاق نہ ہو کر علمیت سے مملو ہوتے ہیں۔ ایک بار غالب کی محفل میں ایک شخص تشریف رکھتے تھے۔ وہ دہلی کے باہر سے آئے تھے۔ انہوں نے مرزا غالب سے کہا کہ آپ کے شہر میں گدھے بہت ہیں۔ مرزا نے تھوڑے سے توقف کے بعد جواب دیا ہاں میاں باہر سے آجاتے ہیں۔ غالب کی زندگی کیونکہ غم و آلام کا منبع تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں اکثر کیا ہے۔ لیکن خطوط میں غالب جہاں ایسے باتوں کا ذکر کرتے ہیں فوراً رجوع کر لیتے ہیں اور پھر اپنا مزاق خود ہی اڑانے لگ جاتے تھے۔ ان کے اس رویے سے قاری کی طبیعت ایک تو منغض نہیں ہوتی اور دوسرے قاری کے دل میں غالب کے تئیں ایک قسم کی

ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔مثلاً ان کے ایک خط کا یہ اقتباس:

''یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔یعنی میں نے اپنے کو اپنا گیر تصور کیا ہے۔جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔''

مرزا غالب کے اس مزاحیہ انداز نے ان کے خطوط کو دلچسپ بنا دیا ہے۔وہ اپنا مزاق اڑانے سے گریز نہیں کرتے۔مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ایک بار برسات کے موسم میں غالب کے بوسیدہ مکان کی چھت چھلنی ہوگئی۔غالب نے اس واقعے کو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں یوں بیان کیا۔

''مہینہ شروع ہوا۔شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مہینہ کی نئ صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے،سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگر چہ گرا نہیں ،لیکن چھت چھلنی ہوگئی، کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔قلم دان کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔اب نجات ہوئی۔''

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں کو اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجہ چاہیے۔لیکن اپنی بات میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی اسکے لیے کلیجہ چیر کر دکھانا پڑتا ہے۔

٦۔جدت طرازی:۔

مرزا غالب کے خطوط کی ایک اہم خصوصیت جدت طرازی ہے۔ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر نہیں جدید نثر کا پیش رو کہا جاتا ہے۔وہ اپنی ہر بات انداز میں نہ کہہ کر ایک نئے انداز میں کہتے ہیں۔جدت طرازی ان کے کلام کی جان ہے۔مکتوب الیہ کو اچھوتے انداز سے مخاطب کرتے۔مثلاً میر مہدی مجروح کے نام بعض خطوط کی ابتدائی عبارتیں:

''برخوردار کام گار میر مہدی علی دہلوی اردو بازار کے مولوی صاحب لوائے ولائے مرتغوی پر علم عباس ابن علی کا سایہ''

''میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو، ادھر آؤ خبریں سنو''

''مارڈالا یار تیری جواب طلبی نے''

''آہاہاہا۔میرا پیارا مہدی، آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔بیٹھو''

یا غالب اپنا نام خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام ایک خط میں اس انداز سے لکھتے ہیں۔

''قبلہ آپ کو کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا اور کیوں جیتا ہے۔''

ان کی اسی جدت پسندی مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔

۷۔منظر کشی:۔

مرزا غالب اپنے خطوط میں دراصل لفظوں کے ذریعہ پورے منظر کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ان کے خط پڑھتے وقت سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔جیسے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں منظر کشی یوں کرتے ہیں۔

''صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟۔وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔شعر کہے، دیوان جمع کیے۔اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے، اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ انحطاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے دوسرا جنم ہم کو ملا۔اگرچہ صورت اسجنم

کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا،اس کو جواب مجھ کو آیا۔اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ ہرمنشی گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو،آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اسکے محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے۔لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان،اس شہر میں نہیں ملتا۔کیا امیر،کیا غریب،کیا اہل حرفہ۔اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔''

انہی کے نام ایک اور خط میں 1857ء کے غدر کا خاکہ یوں کھینچتے ہیں۔

''حکام کو معلوم ہے،مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں گئی،لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں،میری کیا حقیقت تھی۔غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں،دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے،شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔مجرم سیاست پاتے جاتے ہٰں۔جرنیلی بندوبست از دہم مئی سے آج تک،یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے کا نے نہیں پاتا۔تم زنہار یہاں کا اردادہ نہ کرنا۔ابھی دیکھا چاہیے،مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔بہ ہر حال،منشی صاحب کو میرا اسلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔''

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے غالب کی منظر کشی کو اندازہ ہوتا ہے۔انہیں اس فن میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ وہ اکثر جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔یعنی اگر گرمی کے موسم کا ذکر کرنا ہوت وپھر دھوپ اس کی شدت،سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا وقت،لوکی رفتار وغیرہ تمام جزئیات کوخوبصورت انداز میں اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں۔

۸۔شوخی تحریر:۔

غالب کی ہر تحریر شوخی سے بھری پڑی ہے۔الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ جس چیز نے ان کے مکاتیب کوناول اور ڈراما سے زیادہ دل چسپ بنادیا وہ شوخی تحریر ہے۔یہ فن ریاضت یا مشق سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ قدرتی طور پر عطا کیا گیا ایک وصف ہوتا ہے۔اور اسے غالب سے بڑھکر نہ کوئی پرکھ پایا اور نہ ہی استعمال میں لا پایا۔اسی شوخی کے کارن انہوں نے ماہ رمضان میں پانی اور حقہ پینے کو روزے کے بہلانے کا ذریعہ بتایا تھا۔یا ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

''میاں تمہارے دادا امین الدین خان بہادر ہیں میں تو تمہارا دلدادہ ہوں''

یا

''تم چشم نورس ہواس نہال کے''

۹۔علم عروض پر گفتگو:۔

غالب نے اپنے خطوط میں گاہے گاہے علم عروض پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مثلاً چودھری عبدالغفور سرور کے نام میں تحریر کرتے ہیں۔

> ''رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن معین ہے،عرب میں دستور نہ تھا شعرائے عجم نے بحر ہزج میں سے نکالا ہے۔مفعول،مفاعلن ،فعولن۔ہزج مسدس اخرب مقبوض،مقصور،اس وزن پر فعل بڑھا دیا ہے۔۔۔۔رباعی سچ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی۔اور یہ جو مطلع اور حسن مطلع کو رباعی کہتے ہیں اس راہ سے کہ مصرعے چار ہیں۔کہو ورنہ رباعی نہیں ہے نظم ہے۔قدما کو بیشتر اس کا التزام تھا کہ ہر مصرعے میں

قافیہ رکھتے تھے۔خاقانی بے رعایت صنعت ذوقافتین کہتا ہے۔شعر

من بودم وآں نگار روحانی روے　　افگندہ دراں دو زلف چوگانی گوے
خلقی بہ درایستادہ خاقانی جوے　　من در حرم وصال سبحانی گوے

میں ان سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں۔ایک رباعی چار قافیے کی
،اس مضمون خاص کی میں نے لکھی ہے۔بے رعایت صنعت
ذوقافتین۔رباعی

دارم دل شادو دیدہ بینائے　　وزکری گوشتم نہ بود پروائے
خوبست کہ نشونم زہر خودرائے　　گل بانگ انا ربکم الا علائے"

سبق کا خلاصہ:۔

مختصر یہ کہ غالب ے خطوط کی خصوصیات میں طنزومزاح ،شوخی تحریر، تاریخی سند،عروضی گفتگو، دلی کے حالات ،جزئیات نگاری، منظرکشی وغیرہ تمام موجود ہیں۔انہوں نے ایک نیااوراچھوتا اسلوب ایجاد کیا۔اسی اسلوب کی بدولت انہیں اردونثر میں ایک منفرد مقام حاصل ہوا۔غالب کے خطوط کو پڑھتے ہوئے جہاں ایک طرف قاری انداز نگارش کا لطف اٹھاتا ہے وہیں ان کے مزاحیہ اور علمی جملوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عہد سے آگہی بھی حاصل کرتا ہے۔

نمونہ براامتحانی ے سوالات:۔

سوال نمبر1:۔　غالب کے اردو خطوط کا زمانی تعین کی جیے۔؟

سوال نمبر2:۔　غالب کے اچھوتے اسلوب کی نشاندہی کی جیے۔؟

سوال نمبر3:۔　طنزومزاح غالب کے خطوط کی اہم خصوصیت ہے۔مثالوں سے واضح کیجیے۔؟

سوال نمبر4:۔　خطوط غالب کی من جملہ خصوصیات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔؟

اکائی نمبر 18:   اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کا مقام

ساخت:

سبق کا تعارف

سبق کا ہدف

اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کا مقام

نمونہ برائے امتحانی سوالات

امدادی کتب

سبق کا تعارف:۔

اردو نثر کی پہلی کتاب ''سب رس'' ہے۔ یہ 1635ء میں ملا وجہی نے تحریر کی۔ اسے ایک تمثیلی داستان کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ فتاحی نیشاپوری کے فارسی قصہ حسن و دل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا اسلوب مقفی و مسجع ہے۔ اس کے بعد اردو نثر کو فورٹ ولیم کالج میں فروغ ملا۔ اس کالج کا قیام 1700ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس کا بڑا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سے متعارف کروانا تھا۔ ہندوستانی زبانوں کے شعبہ کے صدر ڈاکٹر جان گلگرسٹ بنے۔ انہوں نے کئی اہم اردو ادیبوں کو اس شعبہ میں ترجمے کی غرض سے تعینات کیا۔ ان میں اہم نام میر امن کا ہے۔ انہوں نے اسی کالج کے زیر اہتمام ''باغ و بہار'' تخلیق کی۔ اس کتاب کا اسلوب بھی مقفی اور مسجع ہے۔ ان کی اس کتاب کے جواب میں رجب علی بیگ نے فسانہ عجائب تحریر کی۔ اس کے علاوہ اردو نثر کی کئی اہم کتابیں وجود میں آچکی تھیں۔ غالبؔ نے ایک بار کہا:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

اکثر ناقدین کا یہ ماننا ہے کہ غالب نے غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ کیا ہے۔یعنی غزل ان کے سارے احساسات وجذبات کی ترجمانی نہیں کرسکتی۔اس لئے انہوں نے اپنے حالات وواقعات کوموثر انداز میں رقم کرنے کے لئے خطوط کا سہارالیا۔جوکئی اعتبار سے اردونثر کے آغاز میں سنگ میل ثابت ہوئے۔

سبق کا ہدف:۔

اس سبق میں ہم مرزاغالب کا بحیثیت نثرنگارمطالعہ کریں گے۔اردونثر میں ان کا کیا مقام ہےاس کا جائزہ لیا جائے گا۔نیز اردونثر کو اسلوب کی سطح پرسنوارنے میں غالب کا جوکردار ہےاس پربھی روشنی ڈالی جائے گی۔

اردونثر کے ارتقاء میں غالب کا مقام

مرزااسداللہ خان نے 1848ء کے آس پاس اردوزبان میں خطوط لکھنے شروع کئے۔ان سے قبل مشکل زبان لکھنےاور مقفٰی ومسجع اسلوب کا طریقہ رائج تھا۔ہرکوئی اسی اسلوب کواپنا کرخوش تھا۔غالب نے اس اسلوب سے انحراف کیا۔انہوں نے رواں اورسلیس زبان کا استعمال کیا۔غیرضروری القابات سے اجتناب برتا۔اردوتصانیف میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں۔

عودہندی:۔

یہ رقعات غالب کا پہلامجموعہ ہے۔یہ غالب کی زندگی ہی میں ان کی موت سے چارمہینے پہلے اکتوبر1868ء میں پہلی مرتبہ مجتبائی مطبع میرٹھ سے شائع ہوا۔اس میں 162 خطوط ہیں۔ان کے علاوہ غالب کی لکھی ہوئی دوکتابوں کی تقریظیں اورتین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

اردوئے معلیٰ:۔(حصہ اول)

یہ مجموعہ غالب کی وفات کے انیس روز بعد 6مارچ1869ء کو دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔اس میں 464 صفحات اور472 خطوط ہیں۔

اردوئے معلیٰ:۔(حصہ دوم)

یہ مجموعہ 1899ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔اس کے متعلق مولوی عبدالاحد مالک مطبع نے لکھاہے کہ اس حصے میں خاص کروہ رقعات ہیں جس میں انہوں نے لوگوں کواصلاحیں دی ہیں۔

مکاتیب غالب:۔

یہ خطوط غالب کا آخری مجموعہ ہے۔اس میں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروایان رام پور کے نام غالب کے 115 خطوط ہیں۔ یہ مجموعہ 1937ء میں شائع ہوا۔امتیاز علی خاں عرشی نے 181 صفحوں پر مشتمل ایک دیباچہ لکھا۔تقریظوں اور دیباچوں میں غالب نے وہی مروج مقفی و مسجع نثر کو اپنایا ہے۔مثلاً حاتم علی مہر کی مثنوی کی تقریظ:

''یہ مثنوی کہ مجموعہ دانش و آگہی ہے۔اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں۔لیکن فی الحقیقت ایک نہر ہے۔کہ بحر سخن سے ادھر کو بہی ہے۔سخن ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔دیدہ وروں نے شاید سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش ماہ تمام پایا ہے۔اسی رو سے اس مثنوی نے ''شعاع مہر'' نام پایا ہے۔لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے۔یہ شعاع اس مہر کی ہے جو ذرہ خاک راہ تراب ہے۔سچ تو یوں ہے کہ سخن ور روشن ضمیر مہر چہرہ مرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی میں ید بیضا ہے۔''

یا رجب علی بیگ کی مثنوی ''گلزار سرور'' پر لکھی یہ تقریظ

''مجھ کو دعوی تھا کہ انداز بیاں کی خوبی میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے۔جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے۔کہ ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں، یہ دونوں دل فریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں۔مانا کہ ایک دوسرا کا ثانی ہے۔یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔مالی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعوی پیمبری کا کرے کیا عقل کی کمی ہے۔یہہ بندہ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعوئے خدائی نہ کرے،کس حوصلے کا آدمی ہے۔''

یا خواجہ بدرالدین کی تالیف ''حدائق الانظار'' کا یہ دیباچہ:

''دریں ولا، میرا برادر زادہ سعادت تو اماں، خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں کہ وہ ایک جواں شیریں بیاں، تیز ہوش ہے۔ اور ہر فن کے کمال کی تحصیل میں سخت کش سختی کوش ہے۔ ستار کا جو خیال ہوا ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر پہنچایا۔ مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مالی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا ''معز نامہ'' کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔ بعد اختتام نگارش غالب فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی۔ میں نے ہر چند آمیز و معذرت انگیز گفتگو کی۔ بیداد گرنے ایک بات نہ سنی۔ ایک عذر نہ مانا بھلا اس اصرار کا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانا بھتیجا اور پیارا بھتیجا، ناچار بجز خامہ فرسائی کچھ نہ بن آئی۔''

اردو نثر میں غالبؔ کی اولیت خطوط سے ہے۔ 1850 میں بہادر شاہ ظفر نے غالب کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ 1861ء میں غالب نے ارادہ کرلیا کہ وہ فارسی انشا پردازی ترک کر کے اردو ہی میں لکھا کریں گے۔ اب ہم غالب کے خطوط نے اردو نثر کو سنوارنے میں جو رول ادا کیا اس کا احاطہ کریں گے۔

ا۔ غالبؔ نے سب سے پہلی بات یہ کی کہ القاب و آداب کا کم سے کم استعمال کیا۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ غالب نے یہ سلسلہ کلی طور پر ترک کر دیا لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ اکثر اپنی بات کا آغاز ''میاں، برخوردار، بندہ پرور، مہاراج، پیرو مرشد، بھائی صاحب، وغیرہ سے کرتے ہیں۔ یا اس سے زیادہ لکھتے ہیں تو ''میری جان کے چین، میاں سرفراز حسین، میرے مہربان وغیرہ لکھ دیتے۔

۲۔ غالبؔ نے اردو نثر میں اپنے خطوط کی بدولت طنز و ظرافت جیسے اہم عنصر کو داخل کیا۔ انہوں نے مزاح کا مزاج بلا کا پایا تھا۔ یا یوں کہیے ان کی رگ رگ میں طنز و مزاح رچا بسا ہوا تھا۔ یہ کام وہ مشکل سے مشکل لمحے میں بھی کر گزرتے ہیں۔ مثلاً ایک دن جب غدر کے بعد تحقیقات کے لئے غالب کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے۔ اس نے ان کا حلیہ دیکھ کر پوچھا، تم مسلمان ہو؟۔ یہ بولے ''حضور آدھا'' کرنل نے کہا کیا مطلب؟۔ بولے شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ ایک اور موقع پر کہا میں نے کسی دن نماز نہیں پڑھی اور کسی دن شراب نہیں چھوڑی پھر مجھے مسلمان کیوں سمجھتے

ہیں۔صفدر امام قادری کہتے ہیں کہ اردو نثر میں غالب وہ تنہا تجربہ پسند انسان ہیں جس نے ظرافت کو ایسی معنوی سنجیدگی عطا کی جس کا آخری سرا انسانی سوز سے جاملتا ہے۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ خطوط غالب اپنے عہد کے زوال کی پرتاثیر تفصیل اس وجہ سے بھی بن سکے ہیں کیوں کہ یہاں تاریخ،تہذیب اور عام انسانی کرداروں کو جوڑنے کے لیے ایک ظریفانہ تکنیک ایجاد کی ہے۔

۳۔ شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔غالب ایک منفرد شخصیت تھے۔وہ گھسے پٹے راستوں پر چلنے کے عادی نہیں تھے۔وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے راہ رو بھی تھے اور رہبر بھی۔انہوں نے جس نثر کی بنیاد رکھی اسی پر سرسید اور ان کے رفقا نے ایک جدید اور قابل دید عمارت کھڑی کر دی۔

۴۔ سادگی،سلاست،بے تکلفی و بے ساختگی،گنجلک اور مغلق انداز بیان کے بجائے سادا مدعا نگاری یہ تمام محاسن جو جدید نثر کا طرہ امتیاز ہیں مکاتیب غالب میں نمایاں ہیں۔ان کے خطوط پڑھتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہو کہ الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی جستجو میں انہیں کاوش کرنا پڑیں۔عام ادبی بول چال کا سہارا لے کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحریر میں ''آمد'' ہے ''آورد'' نہیں۔مولانا حالی کے الفاظ میں ''مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت کا یہ انداز اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی مکمل تقلید ہو سکی''۔

۵۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر میں ذات و ماحول کی عکاسی کرنے کا ایک نیا طریقہ وضع کیا۔ان کے خطوط کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی اور ماحول کا پورا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔مثلاً ان کی پیدائش، خاندان،وسائل،معاش،رہائش،وغیرہ وغیرہ کا۔مثلاً ایک خط میں اپنے ماحول کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

> ''میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے۔لیکن اس دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔کیا امیر،کیا غریب،کیا اہل حرفہ۔اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔''

۶۔ غالبؔ نے اردو نثر کو انشائیہ جیسی اہم صنف سے متعارف کروایا۔انہوں نے الگ سے انشایئے تو نہیں لکھے

البتہ ان کے خطوط میں اکثر و بیشتر مل جاتے ہیں۔غالب سے پہلے بھی انشائیہ کی رسم اردو نثر میں موجود تھی۔ملا وجہی کی ''سب رس'' میں گیارہ انشائیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔غالب نے جو اسلوب مکاتیب میں اختیار کیا وہ دراصل انشائیہ نگاری میں معاون ہے۔علاوہ ازیں سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے بھی انشائیہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔

۷۔ خطوط غالب کی اردو نثر کو ایک اہم دین ڈرامائیت انداز ہے۔ڈرامے میں اکثر مکالمے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اردو میں ناول افسانے اور ڈرامے بھی غالب کی نثر کے بعد ہی وجود میں آئے۔مثلاً ان کے ایک خط کا یہ ڈرامائی انداز ملاحظہ ہو۔

غالب: بھائی محمد علی بیگ، لوہاروں کی سواریاں روانہ وہ گئیں؟۔

محمد علی: حضرت ابھی نہیں!

غالب: کیا آج جائیں گی؟

محمد علی: آج ضرور جائیں گی! تیاری ہو رہی ہے۔

۸۔ مکاتیب غالب نے اردو نثر کی ایک اور صنف رپورتاژ کی بنیاد بھی ڈالی۔خبریں سننا اور ان پھر تبصرہ کرنا کم و بیش ہر معاشرے کی جبلت ہے۔اس کی تکمیل لوگ شب و روز کرتے رہتے ہیں۔غالب نے بھی اس سلسلے میں مجلسیں قائم کیں اور اپنی دلی تسکین کا جواز فراہم کیا۔مثلاً آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔'' یا

''ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ۔۔۔۔''

اس طرح غالب صرف حالات و واقعات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ردعمل اور تاثرات بھی قلم بند کرتے ہیں۔یہ سرمایہ غالب رپورتاژ کے ذیل میں آجاتا ہے۔جسے آگے چل کر اردو ادب میں ایک الگ صنفی شناخت ملی۔

۹۔ غالب نے اپنے خطوط میں غیر شعوری طور پر ایک اور صنف کی ایجاد کی جسے آپ بیتی کہا جاتا ہے۔وہ دراصل اپنے دوستوں اور شاگردوں سے اپنا حال تواتر سے بیان کرتے رہتے تھے۔یہ حالات انہوں نے کہیں کہیں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو غالب کی ایک ضخیم آپ بیتی تیار ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ غالب نے اپنے مکتوب کے توسط سے ایک اور صنف کو جلا بخشی جسے مختصر کہانی یا افسانہ کہا جاتا ہے۔افسانے کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت اختصار ہے۔غالب نے اپنے خطوط میں اکثر اختصار سے کام لیا ہے۔انہوں نے شخصی

اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس رواں اور شگفتہ انداز بیاں کو اختیار کیا اس نے مختصر کہانیوں کے لئے راہیں ہموار کر دیں۔

۱۱۔ 1857ء کے بعد علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا۔اس کے بانی سر سید احمد خاں ٹھہرے۔ان کا ساتھ مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد سے جیسے عالموں نے دیا۔اس تحریک نے جدید ادب کی داغ بیل ڈالی۔داستان کو ناول سے بدلا اور غزل کی جگہ نظم کی وکالت کی۔ان کے اس عمل کے لئے غالب جدت طرازی کی روایت اپنے خطوط میں قائم کر چکے تھے۔انہوں نے کئی ایسے الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نئے تھے۔ان کا اسلوب جدت پسند تھا۔انہی نے پہلی سے موجود راہوں پر چلنا مناسب معلوم نہیں کیا۔درحقیقت جدت ان کی طبیعت کا اہم حصہ تھی۔خطوط نویسی کو انہوں نے جو جدت بھرا طرز عطا کیا کہ ایک اعتبار سے ادبی اجتہاد ہے۔مثلاً میر مہدی کے نام لکھا ایک خط یوں شروع ہوتا ہے۔''مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے''۔ایک اور خط کا آغاز یوں کرتے ہیں۔''آہاہاہا۔میرا پیارا مہدی آیا۔آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے۔بیٹھو''۔

۱۲۔ ایک عام مفروضہ یہ رائج ہے کہ غالب نے اگر شاعری کی طرف توجہ نہ کی ہوتی، پھر بھی خطوط کا سرمایہ انہیں عظمت کے اسی مقام تک پہنچاتا جہاں وہ آج موجود ہیں۔اس مفروضے پر بات کرتے ہوئے صفدر امام قادری لکھتے ہیں۔کہ مفروضوں کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غاب نے جب اردو خطوط نگاری کا آغاز کیا، اس وقت اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کے دواوین شائع ہو چکے تھے اور وہ ایک مستند اردو فارسی شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیے جا چکے تھے۔

سبق کا خلاصہ:۔

اکثر ناقدین غالب کے خطوط کو اردو نثر کا پہلا ستون تصور کرتے ہیں۔بعض ناقدین یہ فضیلت میر امن کو دینا چاہتے ہیں۔علی گڑھ تحریک کی اہمیت کو سمجھنے والے اردو نثر کا موجد سر سید احمد خاں کو مانتے ہیں۔اس لئے یہ مسئلہ تھوڑا پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ اردو کی پرانی نثر کب ایجاد ہوئی اور کس شخص کے کاندھے پر سوار ہو کر ایک نئی دنیا تک پہنچی۔حقیقت یہ ہے کہ میر امن کی باغ و بہار باوجود داستان ہونے کے ایک نئی نثر کی پیش رو ہے۔اس سے کسی کو انکار نہیں۔غالب خود بھی میر امن کے اسلوب کے قدرداں تھے۔اس کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب کی مشکل زبان کو

حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے اسلوب پر باغ و بہار کے اسلوب کی پرچھائیاں پڑیں۔صفدرامام قادری تو یہ تک کہتے ہیں کہ کم سے کم مقفی عبارتیں لکھنے کے باوجود سادہ نثر نگاری کا شیوہ میرامن سے ہی غالب نے سیکھا ہوگا۔

مرزا غالبؔ نے سرسید کی دو کتابوں ''آثارالصنادید'' اور ''آئین اکبری'' کی تقریظ لکھیں۔ یہ غدر سے پہلے کی بات ہے۔اس وقت سرسید ابھی تعلیم میں جدید کاری کو بطور مشن نہیں اپنائے تھے۔غالب نے ان تقریظوں میں قدامت سے ہٹنے اور سائنسی فکر کو اپنانے کا مشورہ دیا۔سرسید نے اس مشورے کو پلے باندھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مغربی ہواؤں سے لطف اندوز ہوئے نیز انہیں اردو ادب کا حصہ بھی بنایا۔اس تحریک کے پیچھے غالب کا ذہنی شعور ہی کارفرما تھا۔

اس طرح غالب کے خطوط بیشتر اصناف ادب کے لئے پیش رو ثابت ہوئے۔حقیقت یہ ہے اگر غالب نے اپنے خطوط میں یہ راہیں نہ دکھائی ہوتیں تو اردو کی کئی نثری اصناف ادب کو اپنے نشو نما اور ارتقا میں مزید وقت لگ سکتا تھا۔

نمونہ برائے امتحانی سوالات۔

سوال نمبر 1:۔ اردو نثر میں غالب کے خطوط کے مقام کا تعین کیجئے۔؟

سوال نمبر 2:۔ اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کی کیا خدمات ہیں؟

سوال نمبر 3:۔ غالب کے نثری اسلوب کو مثالوں سے واضح کی جیے۔؟

سوال نمبر 4:۔ اردو نثر اور غالب پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔؟

امدادی کتب:۔

1۔ غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین، مولانا حامد حسن قادری، ادارہ یادگار غالب کراچی، طبع اول ۲۰۰۱ء

2۔ تحریک آزادی اور اردو نثر، ۱۸۵۷ تا ۱۹۴۷ء، ڈاکٹر ضیا الرحمٰن صدیقی، مولانا آزاد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۱۴ء

3۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ڈاکٹر رؤف پارکھ، انجمن ترقی اردو پاکستان۔

ASSIGNMENTS QUESTIONS

Total Marks: 20 (Each Assignment contains Ten Marks)

(نوٹ) مندرجہ ذیل میں دیئے گئے دونوں سوالات کے جوابات لکھنا لازمی ہے۔

سوال نمبر1:۔ اردو شاعری میں غالبؔ کی جدت پسندی پر اظہار خیال کیجئے۔

سوال نمبر2:۔ اردو نثر میں غالبؔ کی خطوط نگاری کی خصوصیات واضح کیجئے۔